

بارے غالب کا کچھ بیاں ہو جائے

پرتور وہیلہ





PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

بارے غالب کا کچھ بیاں ہو جائے

پرتو روہیلہ

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔ ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال

کراچی۔ ۷۵۳۰۰

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان: ۶۴۵

ISBN-978-969-403-168-2

اشاعت اول:

۲۰۱۲ء

تعداد:

پانچ سو

مطبع:

غزالی برادرز، ناظم آباد
کراچی

(دیکھ کر کارڈی امداد یافتہ اداروں کی طرح
انجمن ترقی اردو پاکستان کو بھی اشاعت کتب کے لیے
اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے امداد ملتی ہے)

انتساب

اشفاق سلیم مرزا کے نام

فہرست مضامین

حرفے چند	جمیل الدین عالی	ح
غالب کی زندگی کے تین اہم فیصلے	پرتو روہیلہ	۲۲۵۱
خیال و فطرت پوری کی ”مشکلات غالب“	//	۳۶۵۲۳
غالب کی انھا نگاری و فارسی نامہ نویسی	//	۵۸۵۳۷
غالب کے دینی و مذہبی عقاید	//	۸۶۵۵۹
والہ حیدر آبادی اور شرح اشعار غالب	//	۱۰۳۵۸۷
نقشہ کاغذ اور مرثیہ غالب	//	۲۲۲۵۱۰۳

حرفے چند

عالم شہاسی اور مطالعہ عالم ایک ایسی کائنات ہے کہ اے کلن اور اسٹین ہانگ کی "کائنات" کی طرح برابر وسعت پذیر ہو رہی ہے۔ ہر مرحلے پر خیال آتا ہے کہ شاید یہ کام طے یہ تحقیق عالم پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہو لیکن پھر کوئی عالم شہاسی لم ٹھوٹ کر میدان میں آ جاتا ہے کہ "یہ وقت ہے ٹھیک ٹھیک" اور عالم شہاسی کا ایک آدھ در اس طرح وا کر دیتا ہے کہ اس میں نئی کرنوں کی درآمد کے ساتھ ساتھ عالم کے حدود خال بھی نئے زونوں سے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

جنتاب پرتور ویلہ ایک نغمہ گو شاعر، دہا کار، سفر نامہ نویس کی حیثیت سے تو معروف تھے ہی لیکن دوسرے چند برسوں سے انھوں نے عالم شہاسی کے میدان میں خصوصاً عالم کے مکاتیب فارسی کے تراجم و تدوین کے ضمن میں جو کارنامے سر انجام دیے ہیں وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین و ستائش ہیں۔ پاک و ہند میں یکساں طور پر جنتاب پرتور ویلہ کی ان کاوشوں کو سراہا جا رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی "ہمارے عالم کا کچھ جاس ہو جائے" ہے جو انجمن ترقی اردو سرگودھا کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔

عالم کا تعلق شروع سے انجمن سے رہا ہے۔ یادگار تحریریں انجمن کے ذریعہ تمام شائع ہوتی رہیں۔ ان میں باباے اردو مولوی عبداللہ کی "رد و مقدمہ عالم" خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالرحمن بھٹو کی مقدمہ دیوان عالم جو "محاسن کلام عالم" کے نام سے موسوم ہے اور جس سے جدید خطوط پر عالم شہاسی کا آغاز ہوتا ہے۔ انجمن کے جریڈ سے "اردو" (جنوری ۱۹۶۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت سے یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

پرتور ویلہ کی اس کتاب میں ان کے متفرق تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں جن سے عالم شہاسی کے کئی نرغ سامنے آتے ہیں اور اس باب میں پاسے جانے والے کئی اشکالات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔

فاضل مصنف و سرچ اردو، انگریزی اور پشتو کے علاوہ فارسی پر بھی قابل رشک دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر توجہ عالم کے شارحین پر صرف کی ہے۔ جن میں علامہ نیاز علی چوری اور "ڈوٹی سراحت" کے مصنف علامہ حیدر آبادی بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان شارحین

سے جذبہ حب و شہادتگی کے دائرے میں رہتے ہوئے پرتو رومیہ نے اختلاف بھی کیا ہے۔ تاہم وہ حیدر آبادی کی اولین شرح غالب کے بعض نکات اس طرح اجاگر کیے ہیں کہ غالب جنہی میں ان سے کما حقہ مدد مل سکتی ہے۔ غالب کے عین اہم فیصلے، غالب کے مذہبی معتقدات پر بھی سیر حاصل تحقیق کر کے نتائج کا استنباط کیا ہے۔ جن کے بعد ”ملا سے عام ہے بارہا نکتہ دلی کے لیے“ جیسی راہیں بھی حریہ تحقیق کے لیے کھل جاتی ہیں۔

میں کئی بار اس امر کا اعادہ کر چکا ہوں کہ نہ اس نسبت پر غور ہے، نہ افسوس مگر راقم کا تعلق خانوادہ کوہادو سے ہے اور اس خاندان سے غالب کی سہمی اور علمی اور محبت نہ نسبت معروف ہے۔ چنانچہ غالب کے باب میں جب کوئی نئی دریافت سامنے آتی ہے تو خصوصاً توجہ کے ساتھ پڑھتا اور خوش ہوتا ہوں۔ اس ضمن میں مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ جناب پرتو رومیہ نے غالب کے ایک عزیز ترین شاگرد جو شل ان کی اولاد کے تھے، مرزا ہرگوپال نقض کی غالب شناسی کا ایک اہم باب اپنی اس کتاب میں متعارف کر لیا ہے۔ غالب کی وفات کے بعد حالی، مجروح اور کئی دیگر شاگردان و عقیدت مندان غالب نے مرچے کھکے۔ ان میں مرزا نقض کا طویل مرتبہ غالب جو قاری زبان میں ہے پہلی بار صرف اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں ایک اہم غالب شناس ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنی کتاب ”نور غالب“ (مطبوعہ ادارہ یادگار غالب کراچی) میں شامل کر دیا تھا۔ پرتو رومیہ نے نہ صرف اس مرچے کو اپنی اس کتاب میں تمام و کمال شامل کر دیا ہے بلکہ ہر شعر کا اردو میں ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ یہ ایک طویل مرتبہ ہے اس کی زبان تک پہنچنا کہ یہ دور قاری زبان سے خاصا دور ہو چکا ہے اور کچھ لینا محال ہی تھا۔ لیکن اب پرتو رومیہ کی یہ کاوش جسے میں Labour of love ہی قرار دوں گا، عام اردو دلی ملتے کے مطالعے کے لیے بھی رہ نمائی کرنے کی۔ نقض کے قاری دواوین کا تذکرہ تو سنتے ہیں لیکن وہ شاید اب تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکے۔ اس کا ایک ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ انجمن کے نائب معتمد ادبی امور پروفیسر سحر انصاری نے مجھے بتایا ہے کہ محض سنوہ میں گزشتہ چالیس سال سے مقیم شاعر اور بیڈل شناس جناب حامد اللہ نے مرزا ہرگوپال نقض کے چار لکھی دیوان حاصل کیے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ مکمل نہ سہمی ان کا ایک انتخاب مقدمے کے ساتھ شائع کریں۔ ایسا ہو جائے تو کیا کہنا!

آخر میں راقم ایک بار پھر جناب پرتو رومیہ کو مبارک باد پیش کرتا ہے کہ وہ غالب شناسی کی راہ میں آگے ہی آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ ایسے کوہر آب دار ان کی علمی خواہش کے نتیجے میں آئندہ بھی اردو دنیا تک پہنچتے رہیں گے۔

غالب کی زندگی کے تین اہم فیصلے

غالب کی زندگی پیدائش سے لے کر ان کی موت تک ہنگاموں سے لبریز رہی۔ قدم قدم پر وہ ایسے شدید حالات سے دوچار ہوئے جہاں انھیں سلیم الطبعی کے اظہار کے ساتھ قوتِ فیصلہ کے استعمال کی بھی شدید ضرورت ہوتی۔ سو اگر ان کی پُر آشوب زندگی کا احاطہ کیا جائے تو ایسے مواقع ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ضرور ہوں گے جو ان کے لیے بہت اہم تھے۔ اب اگر ان سیکڑوں اہم واقعات سے اہم ترین منتخب کیے جائیں تو میری نظر میں وہ صرف تین بنتے ہیں اور وہ اس لیے نہیں کہ ان سے مقابل ہو کر غالب نے انتہائی ہوشیاری اور سلیم الطبعی کا اظہار کیا بلکہ اس لیے کہ اس وقت کے حالات سے دوچار ہو کر غالب نے جو فیصلے کیے وہ، نئے اہم، اثر انگیز اور دور رس تھے کہ انھوں نے نہ صرف غالب کی زندگی کا رخ بدل دیا بلکہ اردو ادب کی تاریخ پر بھی نہ مٹنے والے نقوش مرتب کر دیے۔ ان اہم ترین فیصلوں میں سب سے وقیع فیصلہ اسلوبِ ہیولہ کو ترک کر کے آسان گوئی کا فیصلہ ہے۔ دوسرا فیصلہ وہ ہے جو انھوں نے نگہتے جاتے ہوئے کھنکھتے قیام کے دوران آغا میر سے ملاقات کے لیے اپنی چند شریلا پیش کر کے کیا اور تیسرا فیصلہ وہ ہے جو انھوں نے دہلی کالج کی مدد سے انکار کی صورت میں کیا۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں فیصلوں میں پہلا فیصلہ تو خالصتاً ادبی ہے، یعنی جس کا تعلق غالب کی ادبی شخصیت، اور ان کی ادبی اقدار سے ہے جب کہ باقی دونوں فیصلے غالب کی معاش سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ فیصلوں کی اپنی بنیاد سماجی اور اخلاقی اقدار پر کیوں نہ ہو ان کے نتائج لازماً معاشی تھے۔

ذہن نظر مضمون میں ان عوامل پر ہی بات ہوگی جو ان تینوں فیصلوں کا باعث ہوئے۔
 عبدالصمد (برصغور) کا غالب کی زندگی میں ورود ایک اتفاق بلکہ حسن اتفاق سی لیکن
 دس گیارہ سال کی عمر میں ان کی شاعری کی طرف میلان اور پھر ظہوری اور ہیدل جیسے
 فارسی شعرا کی طرف رغبت تو لازمی ان کے فطری رجحانات تھے جن سے خود ان کے لیے
 کوئی مفر نہیں تھا۔ اس لیے جب غالب مبداء فیاض کی بات کرتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔
 ورنہ ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ عبدالصمد کے ذہن اثر انھوں نے آگرے ہی میں فارسی شاعری
 بھی شروع کر دی ہوتی۔ جب کہ فارسی شاعری پر انھوں نے تقریباً کلکتے کے سفر کے
 دوران زور دیا۔ سو کلکتے کے قیام کے دوران سراج الدین احمد کے ایما پر انھوں نے گل رحنا
 کا انتخاب کیا اور اپنے اردو کلام سے دو ٹکٹ نکال ڈالے تو یہ اس دیوان سے تھا جو سفر
 کلکتے سے پہلے مرتب ہو چکا تھا۔

گل رحنا کے دیباچہ رنختہ میں غالب بڑے حد و مد سے تحریر فرماتے ہیں:

”نگارۂ امیں نامہ را آں در سراست کہ پس از انتخاب دیوان رنختہ
 مگر و آردن سراپای دیوان فارسی بر نیز دو با استفادۂ کمال امین فرخ رفین
 پس زانوائے خوشنقش نصیب۔ امید کہ سخن سراپاں سخنور ستائی پر آمد
 ایماقی را کہ خارج از میں اور اقی یا بند، از آچار تراوش رگ کلک این
 نامہ سیاہ بختا سند و چامہ گرد آرد راستائیش و نکویش آں اشعار مضمون و
 ماحوذ نگارند۔ یا رب امیں یونے ہستی ناشدیدہ از نیستی بہ پیدائی تا
 رسیدہ یعنی نقش بضمیر آمدۂ نقاش کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم و بہ مرزا
 نوشہ معروف و بر غالب متخلص است چنانچہ اکبر آبادی مولد و و ہلوی
 مسکن است فرجام کار جنبی مدفن نیز باد۔“

(کلیات نثر غالب ۱۲۸۷ء مطبع قول کشور، ص ۶۰)

یہاں غالب یہ نہیں بتاتے کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں یعنی اپنا دو تہائی اردو کلام
 نظری کر دینے کا سبب کیا ہے۔ البتہ وہ دیباچہ ”گل رحنا“ میں اتنا ضرور فرماتے ہیں:

”میں نے اردو گوئی میں بھی وہی طریقہ روا رکھا ہے جو فارسی میں روا رکھا تھا۔ میری شاعری کے دو دروازے ہیں۔ ایک اردو اور ایک فارسی۔“ (آثار غالب - شیخ محمد اکرام - ص ۷۷)

دیکھا ہے میں اصل الفاظ اس طرح ہیں:

”چوں در آواز خار خار بگر کاوی شقلم ہمہ صرف نگارش اشعار اردو زبان بودہ در مسلک این تحریر ہماں جاوہ گزار وہ و ہماں راہ سپردہ شد۔ ہر آئینہ این چمنستان را دور بروی ہم کشود۔ غنچیں در با اشعار ہندی بگو ہر آمودہ دو بھیں در چوں آغوش شوق بروئی پارسیاں واست و بام این صحنہ بزبان ادا شناساں گل رعنا۔ الہی این گل رعنا را بکوشش دستار قبول جاوہی و ہر کہ این را گرامی می نہد سپاسی از وی بر من خبی۔ اللہ بس باقی ہوں۔“

(کلیات نثر غالب ۱۲۹۷ھ مطبع نول کشور، ص ۵۹)

اب چوں کہ ہر اگر اف ماقبل میں ہے کہ ”نگارندہ این نامہ آن ... بگرد آوردن سرمایہ و فارسی بر خیزد“ اور یہاں وہ خود لکھتے ہیں کہ ”بگر کاوی شقلم ہمہ صرف نگارش اشعار اردو زبان بودہ“ اس لیے مسلک این تحریر سے یہاں مطلب فارسی ہوا اور ”ہماں جاوہ گزار وہ و ہماں راہ سپردہ شد“ سے مطلب یہ ہوا کہ فارسی میں بھی میں نے وہی راہ اختیار کی ہے جو اردو میں اختیار کی تھی۔ جب کہ محترم محمد اکرام صاحب نے اس کے برخلاف لکھا ہے یعنی اردو میں وہ راہ اختیار کی ہے جو فارسی میں اختیار کی تھی۔ بہر صورت فی الوقت مسئلہ زیر بحث صرف یہ ہے کہ خود پسند، مغلوب الایمانہ انفرادیت گزیدہ غالب نے کن حالات کے تحت اپنے اسلوب شاعری میں تبدیلی کا فیصلہ کیا اور وہ کیا عوامل تھے جو اس فیصلے کے ذمے دار ہوئے۔

ہم عصر شاہدوں میں جاتی سے بڑھ کر مستند و موثر گواہ کون ہو سکتا ہے۔ سو وہ اس ضمن میں یادگار غالب میں کہتے ہیں ”مرزا کے حق میں جو پیش گوئی میر تقی میر نے کی تھی ان کی

دونوں شقیں ان کے حق میں پوری ہو گئیں۔ ظاہر ہے مرزا اذل اذل ایسے رستے پر پڑ گئے تھے کہ اگر استقامت، طبع اور سلامتِ ذہن اور بعض صحیح الہذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چینی ہم عصروں کی خردہ گیری و طعن و تقریض، سزا روا نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اہل و غلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے تقریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت بڑی شوکت و شان دار معلوم ہوتی تھیں مگر معنی ندارد۔ گویا مرزا پر ظاہر کرتے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔" (یادگار غالب، ص ۱۱۱) اکثر سوانح نگاروں نے ان تینوں عوامل کا ذکر کیا ہے۔

صحیح الہذاق دوستوں کی روک ٹوک کے ضمن میں حالی کہتے ہیں۔ "جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بدھ گئی اور مرزا ان کو اپنا خاص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انہوں نے اس قسم کے اشعار پر روک ٹوک کرنی شروع کی۔ یہاں تک کہ انہیں کی تحریک سے انہوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو ٹکٹ کے قریب نکال ڈالا اور اس کے بعد اس روش پر چلتا بالکل چھوڑ دیا۔" ظاہر حالی کی نظر میں ان صحیح الہذاق لوگوں میں صرف یا خصوصاً مولوی فضل حق ہی تھے جن کی ایما پر غالب نے اپنی پرانی روش ترک کی۔ ذکر غالب میں مالک رام صاحب نے بھی مولوی فضل حق ہی کا ذکر کیا ہے۔ "اردو میں وہ اپنی بیدلانہ طرز مولوی فضل حق کی روک ٹوک پر ٹکٹہ جانے سے پہلے ترک کر چکے تھے۔" (ص ۱۶۰) لیکن دوسرے سوانح نگار مولوی فضل حق کے ساتھ آزرہ اور شیفتہ کو بھی شامل کرتے ہیں۔ شامل ہی نہیں کرتے بلکہ برابر کا شریک تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ تالیما پری کار پڑا اپنی مشہور تصنیف غالب میں تحریر کرتی ہیں۔ "بہت سوں کا خیال ہے کہ اگر فضل حق نہ ہوتے تو غالب کے حق میں میر کی یہ پیش گوئی کہ کمال استاد نہ ملنے کی صورت میں یہ لڑکا مہمل بچنے لگے گا، سچی بات ثابت ہوئی۔ غالب کے اسلوب کے تعلق سے ایسی سخت گیری کا مظاہرہ کرنے میں فضل حق اکیلے نہیں تھے۔ آزرہ جیسے خن خن اور سادگی کے شیعانے بھی غالب کو اعتبار خیال کے دوسرے وسائل کی تلاش کی ترغیب دی۔ ان کے اثر سے نہ صرف اسلوب شاعری میں بلکہ شاعر کے مزاج

میں بھی سلامت دوی پیدا ہوئی۔ ظ۔ انصاری تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ راجپوتی عبدالصمد کو نہیں بلکہ فضل حج، آزادہ اور شیخہ کو غالب کا استاد سمجھنا چاہیے۔ (ص ۱۳۷، ۱۳۵)

طعن و تقریریں اور ہم مصریوں کی خردہ گیری کے ضمن میں ایک لطیفہ بہت دہرایا گیا ہے جس کا حالی نے مولوی عبدالقادر رامپوری کی جب کہ پون کمار ورنے (غالب، شخصیت اور عہد) آغا جان پیش کی زبانی بتایا ہے۔ حالی کی زبانی یہ لطیفہ اس طرح ہے: ”ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور جن کو کلمہ دہلی سے تعلق رہا تھا، مرزا سے کسی موقع پر کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر مجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دوسرے مولویوں کے مرزا کے سامنے پڑھے۔

پہلے تو دو غزل بھینس کے اڈے سے نکال

پھر دوا بھتی ہے گل بھینس کے اڈے سے نکال

مرزا سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہ حراج کہا: ”میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں ابھی دیکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو مظلوم ہوا کہ مجھ پر اس بڑے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جانتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔“ (ص ۱۱۲)

ظاہر ہے غالب کے کلام میں وہ سارے اشعار جو انھوں نے اخفائے حال، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نہ ہونے یا کوئیم مشکل و گرنہ کوئیم مشکل کی ضمن میں کہے ہیں وہ درحقیقت اس ہم مصری خردہ گیری اور طنز و تقریر کے جواب میں دفا عانی کہے گئے ہیں اور اس کی شدت کی تصدیق کرتے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں سستی نہ سہی

گر خاموشی سے قائمہ اخفائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھتا محال ہے

مشکل ہے زہن کلام میرا اسے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سن کے چائل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل دیگر نہ گویم مشکل

دہلی بات استقامت طبع اور سلامت ذہن کی تو اس کا چوں کہ غالب کی شخصیت سے
براہ راست تعلق ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عوامل پر بھی ایک ملازما نظر ڈال لی
جائے جنہوں نے غالب کی شخصیت کی تعمیر میں مدد کی۔

مرزا غالب کی پیدائش ۸ ربیع الثانی ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء آگرے میں ہوئی۔
ان کا پورا نام اسد اللہ بیگ خاں تھا۔ ان کے والد کا عرف میرزا اولہا تھا ان کا میرزا
نوشہ ہوا۔ ان کے دادا تو قان بیگ خاں سرفرد سے جب ہندوستان آئے تو پہلے لاہور
میں نواب حسین الملک (میر تقی) کے ہاں ملازم ہوئے۔ میر تقی کی وفات پر وہ دہلی پہنچے اور
نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں کی سرکار سے وابستہ ہوئے اور ان کے قوسل سے
شاہ عالم کی سرکار میں پہچاس گھوڑے، خمارے اور نشان پر ملازم ہوئے اور وہاں سے مظہر
سلطنت کی ملازمت ترک کر کے مہاراجہ جے پور کے دربار سے وابستہ ہوئے اور وہی سے
آگرہ چلے گئے۔

مرزا غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ تو قان بیگ کی
موت کے بعد عبداللہ بیگ خاں کنوئیں میں نواب آصف الدولہ کے ملازم رہے۔ وہاں
سے حیدرآباد میں نواب نظام علی خاں کی ملازمت اختیار کی اور وہاں کی خانہ جنگی سے گھبرا
کر الود کا قصد کیا۔ وہاں راجہ راؤ بھلا ورسنگھ سے وابستہ رہے اور وہیں زمینداروں کی ایک
مقامی لڑائی میں مارے گئے۔ عبداللہ بیگ خاں کی شادی میرزا غلام حسین خاں کیدان
کی لڑکی عزت النساء بیکم سے ہوئی۔ تولد غلام حسین خاں کیدان سرکار میرٹھ کے ایک
نوجوان آفیسر اور آگرے کے عائدین میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں اپنی سسرال
میں مرزا اولہا کے نام سے مشہور تھے اور خاندانِ اماد تھے۔ ان کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ان کی

وفات پر راجہ بختاور سنگھ رئیس اور نے ”دو گاؤں میر حاصل اور کچھ روڑیہ“ میرزا مرحوم کے لڑکوں کی پرورش کے لیے مقرر کر دیا جو ایک مدت تک چاری رہا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کب اور کیوں بند کر دیا گیا۔

مرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے بچوں کی سرپرستی اور دیکھ بھال ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے کی۔ نصر اللہ بیگ خاں کی شادی غفر الدین دلاور الملک احمد بخش خاں والی لوہاروی بہمن سے ہوئی۔ لیکن ان کے کوئی اولاد نہیں تھی اور پھر جلد ہی ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ چنانچہ غالب اور ان کے بہمن بھائیوں کا سہارا صرف نصر اللہ خاں ہی رہ گئے۔ نصر اللہ بیگ خاں خود انگریزوں کی عملداری سے پہلے مرہٹوں کی طرف سے فرانسیسی جنرل Perron کی ماتحتی میں اکبر آباد کے حاکم تھے۔ ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک Lord Lake نے اس علاقے پر چڑھائی کی تو مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے اہل نواب احمد بخش خاں کی ایما پر بغیر دفاع کے ہتھیار ڈال دیے اور شہر لارڈ لیک کے حوالے کر دیا جس خدمت کے عوض ان کو انگریزی سرکار میں چار سو سوار کار سالدار بنا دیا گیا اور مسترہ سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا اور اس کے بعد مرزا نصر اللہ خاں نے خود سوک اور سونسا لاکھ سوا آدھائی کے دو ذریعہ پر گئے جو بھرت پور کے نواح میں تھے ریاست بلگر کے سپاہیوں سے جھگڑنے لگے۔ جنرل لیک نے سابقہ خدمات کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ دونوں پر گئے بھی ان کو تاحین حیات ان کی جاگیر میں دے دیے۔ نصر اللہ بیگ خاں اچانک باقی سے مر کر ۱۸۰۶ء میں وفات پا گئے۔ اس وقت مرزا کی عمر آٹھ برس اور چند ماہ تھی۔

نصر اللہ خاں کی وفات پر ان کی تاحین حیات جاگیر سوک اور سانسہ انگریزوں نے واپس لے لی اور رسالہ بھی توڑ دیا۔ البتہ یہ طے پایا کہ نواب احمد بخش خاں پچاس سواروں کا ایک دستہ برقرار رکھیں گے۔ اس دستے کے اخراجات اور نصر اللہ خاں کے پسماندگان کی پنشن کے لیے یہ حکم صادر ہوا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر کے لیے جو بچیس ہزار روپیہ سالانہ دیتے ہیں وہ اس شرط پر معاف کیے جاتے ہیں کہ آئندہ اس کے

پندرہ ہزار روپے اس دستے کی خورد و پرداخت پر خرچ کریں گے اور باقی دس ہزار مرزا مرحوم کے خاندان کو بطور بخشش کریں گے۔ لیکن نہ جانے کیسے اس فیصلے کے ایک ماہ بعد ۱ جون ۱۸۰۶ء کو احمد بخش خاں نے لاہور ایک سے ایک غلط حاصل کر لیں جس میں درج تھا کہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کو پانچ ہزار روپے سالانہ حسب ذیل تفصیل سے ادا کیا جائے گا۔

خوبہ حاجی دو ہزار روپے سالانہ، مرزا نصر اللہ بیگ کی والدہ اور تین بیٹیاں ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ، مرزا نوشہ اور میر یوسف برادر زادگان مرزا نصر اللہ خاں مرحوم ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ۔ گویا پہلے دس ہزار کے پانچ ہزار ہوئے اور ان پانچ ہزار میں بھی خوبہ حاجی کو مرزا نصر اللہ خاں کے پادشاہی کے پس ماندگان میں شامل کر کے دو ہزار روپے سالانہ کا حقدار بنا دیا۔ خوبہ حاجی کی اس بخشش میں شمولیت ہی اس مقدسے کی بنیاد تھی جس کے لیے غالب نکلے گئے اور ناکام ہونے پر ملکہ و کنواریہ کے دربار میں بھی عریض گزار ہوئے لیکن کامیابی میسر نہ ہوئی۔

یہ چند حقائق کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جو اکثر ذکر غالب مصنفہ مالک رام سے لیے گئے ہیں اور غالب کے خاندانی ماحول اور ان کی تربیت و ذہنی نشوونما کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔ ان حقائق سے جو امور ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ خاندان ان طالع آزمائشی خدمت گاروں کا تھا جو توکل بخدا ہندوستان کی دستوں میں اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتیں لے کر پہنچا تھا اور زندگی کے تقاضوں کے تحت جہاں کہیں بھی دو چار آسودگی کے لحاظ کا امکان نظر آتا اپنی کمر کھول دیتا تھا۔ چون کہ اولاً ان کے اپنے آگے پیچھے اقامتی زندگی کی پابندیاں اور قبائلی و اجتماعی رشتوں کی قیود و تقاضے نہیں تھے اس لیے وہ ان ساری اقدار سے وقتی طور پر آزاد تھے جو اخلاقیات کے ضمن میں آتے ہیں۔ چنانچہ وقاداری، دیانت، ایقانے عہد، راستی، حق شناسی جیسی ساری اقدار نہ اس ماحول میں موجود تھیں اور نہ ہی ان لوگوں کا اسلوب حیات ان اقدار کے تعیش کا متحمل ہو سکتا تھا۔ اس ماحول کے سبب سے اہم ترین متحرک اور کارآمد قدر ہوشیاری، موقع شناسی اور حیات پرستی

تھی۔ ہر وہ عمل کہ رخصت حیات پر قرار رکھے جائز تھا اور ہر وہ حرکت جو پانی سے سر ہا ہر رکھنے میں مدد ہو مباح تھی۔

لیکن یہ تو خاندان کی اور ماحول کی اجتماعی صورت حال تھی۔ انفرادی طور پر دیکھا جائے تو غالب کے دادا کا بھی کوئی تصور ٹھکانہ نہ تھا۔ ان کے حالات میں شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن جب ان کے والد بھی یہ حیثیت خاندان و اماں ہی مرے، تو یہ صورت حال قدرے غیر معمولی تھی۔ غالب نانہال ہی میں رہے جو اس وقت خاصی متحول شہر کی جاتی تھی۔ ماحول خالص جاگیردارانہ تھا۔ روک ٹوک کے لیے نہ باپ، نہ چچا نہ بڑا بھائی۔ نانہال کے قریبی عزیزوں میں ماموں کا ہی سراغ نہیں ملتا ہے تو اتنا تو پھر دور کی بات ہے۔ ابھرتی ہوئی جوانی صورت شکل قد و قامت، اس پر مستزاد متحول کے پس منظر اور شاعر کی اتنا وسیع نے اور بھی کھل کھلائے۔ فرض

ہو اور ذوق مستی و لہو و سرور و سوز
بیست شمر و شاہد و شمع و سے وقار

غالب نے بھی اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لیکن ان کے یہ لائق تعلق زیادہ عرصے نہیں چلے گئے کہ زمینی حقائق نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ ان زمینی حقائق میں ایک تلخ حقیقت تو ان کے والد کی خانہ و اماں سے پیدا ہونے والی صورت حال تھی جس نے ان کی خوشی میں زہر گھول دیا تھا اور ان کو اس عزت و وقار سے محروم رکھا تھا جو عام حالات میں کسی شخص کو اپنے باپ کے گھر میسر ہوتا ہے۔ دوسری ان کی معیشت کی غیر مطمئن صورتحال تھی جس نے ان کی نفسیات پر اثر ڈالا۔ صاحب آثار غالب نے اس جگہ ایک بڑا معقول سوال اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں ”یہ ایک معرہ ہے کہ اگر مرزا کی نانہال اس قدر خوشحال تھی اور وہاں انھیں ہر طرح کا پیش و آرام میسر تھا تو انھیں آگرہ چھوڑنے اور نواب احمد بخش یا کسی چھوٹی جگہ کا دست نگر ہو کر دہلی جانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ اگرچہ جب مرزا شروع شروع میں دہلی گئے ہیں تو ماں انھیں آگرہ سے کبھی بکھار

کچھ بھیج دیا کرتی تھیں۔ لیکن اس کے بعد مرزا پر سخت سے سخت مصیبتیں آئیں، ان کا بہائی دیوانہ ہو گیا، قرض خواہوں نے ان کی زندگی بھرن کر دی، قمار بازی کی وجہ سے انھیں ٹیل جانا پڑا۔ فرضیکہ ان پر مصیبتوں اور رنج و الم کے پہاڑ ٹوٹے لیکن ان کے غلطوں میں اس امر کا کوئی نشان نہیں کہ ان کی تانہال میں سے کسی نے آکر ان کی خبر بھی پوچھی ہو۔۔۔ کیا اس تمام صورت حال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ہے جا ہو گا کہ مرزا کے لیے تانہال میں فقط غوثی اور بے فکری نہ تھی، کلنتیں اور باطنی کشش بھی تھی۔“ (ص ۳۹)

فرض ان حقائق کو نظر میں رکھا جائے تو مرزا کی نشوونما اور حالات زندگی میں (احساس کسری) کے نفسیاتی اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ ایک شان دار ماحول میں پیدا ہوئے اور بچے لیکن اس ماحول کے مقابلے میں انھیں اپنی کمزوری اور کوتاہیوں کا احساس تھا۔ خدا نے ہمت بلند دی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ان کوتاہیوں کی صفائی کی جائے۔ انھوں نے مادی ترقیوں کے لیے فضا ساز کار بھجوا دیے۔ آنکھیں بند کیں۔ بزرگوں نے جو میراث چھوڑی تھی اس پر قناعت کی اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے شعر و سخن کا راستہ چنا تاکہ اس میں اتنی شہرت اور ناموری حاصل ہو جائے کہ اپنے ہم چشموں میں سے کسی سے کمتر نہ رہیں۔ چنانچہ خود اپنے ایک غباری خط میں لکھتے ہیں:

”آہ ازمن کہ مرا زیاں زدہ و سوختہ خرمن آفریدند۔ نہ بآئیں نہایگان
خویش سلطان خمر دارائے کلاہ کرے و نہ بفرہنگ فرزائگان، بوطی آسا
علم و ہنرے۔ گفتم درویش باشم و آزاوانہ راہ سپرم۔ ذوق سخن کہ ازلی
آوردہ بود و برنی کرد و مراں ہداں فریفت کہ آئینہ زد و دین و صورت معنی
ممودن نیز کار نمایاں است۔ سر لشکری و دانشوری خود نیست۔ صوفی
گری کہوار بہ سخن گری روی آر۔ ناگزیر ہم چہاں کردم و سفینہ و بحر
شعر۔۔۔ رواں کردم۔ کلم علم شد و تیر ہائے شکستہ آہا قلم۔“ (ص ۴۱)

اپنے اس خیال کو کہ تیر ہائے شکستہ آہا قلم بن گئے، انھوں نے ایک رباعی میں بھی نظم کیا ہے۔

رباعی

غالبؔ بہ گھرِ دردِ زادِ خم
زادِ رو بھلائے دمِ تیغِ است دم
چوں رفت سہدی زوم چنگ بہ شعر
شد تیرِ غمکِ نیا گوں قلم

غالبؔ نے شعر و سخن کے راستے کا انتخاب محض دوستوں کی ترغیب یا احباب کی تشویق پر نہیں کر لیا۔ بلکہ انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کا اور اس وقت کی دہلی کے ماحول کا اچھی طرح جائزہ لے کر یہ فیصلہ کیا۔ یوں تو غالبؔ شادی سے پہلے بھی دہلی آیا جایا کرتے تھے لیکن جب شادی کے بعد دہلی آئے تو یہ وہ وقت تھا جب مرہٹوں کا زور ٹوٹ چکا تھا اور انگریزی قلم و نسق قائم ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں دہلی اور دہلی کے اطراف امن و امان تھا اور ایک بار پھر یہاں کی مجلسی زندگی عود کر آئی تھی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کی گہما گہمی تھی۔ شہر کی آبادی میں اضافہ ہو گیا تھا اور علم و فن کا بکھرا ہوا شیرازہ دوبارہ ہندھ ہو گیا تھا۔ بقول حالیؔ کے ”دارا خلفہ دہلی میں چند ایسے باکمال جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہ جہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتے تھے۔“ صاحب آثار غالبؔ نے اس دور کو انگلستان و مغرب کی دو مشہور و معروف تحریکیں Renaissance اور Reformation کے مماثل و متوازی قرار دیا ہے۔ انگلستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا سولہویں صدی میں ہوئی اور اس ہی کے باعث علم عام ہوا۔ دہلی میں بھی چھاپہ کا آغاز قریب قریب اسی دور میں ہوا اور اس نے اشاعتِ علم میں اہم کردار ادا کیا۔ نثار خانہ کا اہم واقعہ انجیل کا انگریزی میں ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ کام شاہ ولی اللہؒ نے قرآن پاک کا پہلی بار فارسی میں ترجمہ کر کے کیا۔ Renaissance میں جس طرح عام ملکی زبانوں کی مقبولیت کو ترقی ملی بالکل اسی طرح ہندوستان میں یہ کام فارسی اور عربی کے مقابلے میں اردو نے کیا۔ دہلی کے علما و فضلا نے اردو کی ہر گیری کو محسوس کر کے اپنی توجہ اردو کی جانب مبذول کر دی اور اس ضمن میں شہرہ آفاق اقدام شاہ ولی اللہؒ

کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے قرآن کا اردو میں ترجمہ کر کے کیا۔

یوں تو قرآن پاک کے فارسی اور اردو تراجم بھی اشاعتِ علم ہی کے اقدامات تھے لیکن عمومی تعلیم کی اشاعت اور عمومی درس و تدریس کی ترقی میں جو بے مثال بیدار مغزی اور صحیح قوت فیصلہ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے دکھائی اس کی مثال مشکل ہے۔ چنانچہ جب دہلی میں انگریزی سرکار نے دہلی کالج قائم کیا اور وہاں دہلی کے اکثر غنا اور اکثر مسلمان امرا کو وہاں اپنی اولاد کی تدریس میں شامل ہوا تو شاہ صاحب نے جی شدد سے وہاں تعلیم کے تحصیل کی حمایت کر کے مسلمانوں اور خصوصاً اونچے طبقے کے امرا کی جتنی غلطی کو دور کیا جس کے نتیجے میں اس فیض کے دریا نے آہستہ آہستہ بہتا اور تکتے اطراف کو سیراب کرنا شروع کر دیا۔ دہلی کالج کا قیام علی گڑھ کالج سے پچاس سال پہلے عمل میں آیا۔ چوں کہ سرسید خود یہاں زیرِ تعلیم رہے تو میرے خیال میں علی گڑھ کا ساما جیو پرنٹ انھوں نے دہلی کالج ہی سے تیار کیا۔ دہلی کالج کے معیارِ تعلیم اور وہاں سے اساتذہ کے معیارِ علم کا اندازہ سرسید، ذکاء اللہ، حالی، نذیر احمد وغیرہ ہم جیسے کامران فن سے لگایا جاسکتا ہے جنھوں نے اس درس گاہ سے تحصیلِ علم کی۔

اس دور کی علمی سرگرمیوں کا منظر نامہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کی تحریکِ اصلاحِ دین کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس تحریک کو دہلی تحریک بھی کہا جاتا ہے اور سرسید نے اس کو مارٹن لیوٹرکی Reformation سے مماثل قرار دیا ہے۔ یہ وہ تحریک تھی کہ جس میں اس دور کا ہر صاحبِ علم و فکر مسلمان اس کے حق میں یا اس کے خلاف شریک تھا۔ اور باوجود اس کے کہ عمومی طور پر شعرا کو دین اور دینی مسائل کی بات کیوں سے لا تعلق ہی گردانا جاتا ہے، اس دور کے تمام اکابر شعرا بھی کسی نہ کسی طرح اس تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ شاہ نصیر، مومن، غالب اپنے اپنے طور پر اس تحریک کے حق میں یا مخالف رائے رکھتے تھے۔ مقلدین میں مولوی فضل حق تھے اور غیر مقلدین میں شاہ اسماعیل اور سرسید احمد خاں۔ مومن خود سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ غالب نے بھی ان مباحث میں ایک حد تک عملی حصہ لیا۔ چنانچہ اس تحریک سے تعلق جو

اہم ترین بات ہے تو وہ یہ کہ قائب کا نقطہ نظر غیر تقلیدی اور شاہ اسماعیل سے ہم آہنگ تھا یا وجود اس کے کہ ان کا ربط خلیفہ اور قلعی خاطر مولوی فضل حق سے جو مقلدین کے سرگرم ترجمان تھے، بہت زیادہ تھا۔ صاحب آثار قائب نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جس طرح مرزا قائب نے شاہ اسماعیل کو مذہب میں تقلید کے خلاف جہاد کرتے دیکھا اس نے ان کی طبیعتی آزاد خیالی کو اور بھی راسخ کر دیا اور اس ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے بھی قرآن و سنت نویسی اور فن شعر کوئی میں استادوں پر آزادانہ بحث چینی کی اور کہا کہ ”اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ سب صحیح نہیں۔ ہر نہ اپنی کثیر مراد مستقیم نہیں ہوتی۔“ (ص ۵۱۔ آثار قائب۔)

آگرے کے قیام میں مسٹر حسین کے طرز و طبع کی قائب نے پر دانہ کی اور وہ ان کو ”جامل“ ہی تصور کرتے رہے۔ لیکن دہلی کے قیام میں اہل علم و صاحبان ذوق سے قریبی تعلق، ہم چشم، باذوق اصحاب کی روک ٹوک، علم و ادب کے معیاری ماحول اور پھر فارسی شعرا کے باقاعدہ مطالعہ نے انھیں اپنے اسلوب پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں ان کی وہ چمکی جس جس نے ان کے آباد اجداد کو زمانے کے سرد گرم میں زندگی کی راہ بتائی تھی، نکا یک جاگ اٹھی اور چوں کہ وہ جانتے تھے کہ میرے پاس ذبحہ رہنے کے لیے صرف حار شعر و سخن ہی ہے، اور اس ماحول میں اگر اپنی انفرادیت برقرار رکھنی ہے، ہم چشموں کے شانہ بشان چلنا ہے اور اپنے مطلوبہ و انتخاب کردہ طبقے ہی میں زندگی گزارنی ہے تو اپنے اسلوب کا رخ کو تبدیل کرنا ہوگا۔ ورنہ خود پیدل کی طرح فنا ہو جائے گا اور کہیں نشان باقیات نہ ملے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ آگاہی انھیں رفتہ رفتہ ہی ہوئی ہوگی اور یہ فیصلہ انھوں نے خواب میں کوئی بیارت پا کر نہیں کیا ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں انھوں نے اپنے اسلوب کے دفاع میں آگرے میں کئی گئی رہائی کو قدرے تبدیل کر دیا۔ یعنی:

مشکل ہے زبں کلام میرا اسے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو شن کر جامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
کویم مشکل و کرت کویم مشکل

اس کے دوسرے مصرع کو تبدیل کر کے "من من کے منتوران کامل" کر دیا۔ اس تبدیلی سے یہ جملہ یہ ملتا ہے کہ اب انھیں اپنے معترضین کی بات میں حقیقت اور سچائی بھی نظر آنے لگی اور ان کی نقدِ ظلم پر ان کا اجتہاد بھی بحال ہو گیا۔ اور پھر وہ فارسی کلاسیک شعرا کی پیروی کو بھی راست روی تصور کرنے لگے۔

۔ ہرزہ مشتاب دہنے جاوہ شناساں بردار

اسے کہ دردِ سخن چوں تو ہزار آہ و دردت

"گلِ رحمت" میں شامل دیوانِ ریخت کے متعلق آزاد (صاحبِ آبِ حیات) کا بیان

ہے کہ یہ انتخاب مولانا فضل حق اور مرزا خانی کو تو ال وہلی نے کیا۔ جب کہ مرزا کے اپنے بیانات اور معاصرانہ تذکروں سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ انتخاب خود غالب ہی نے کیا۔ یہ خیال بھی درست ہی ہو گا لیکن مرزا کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہوئی اس سے کسی خارجی رجحانی یا دخل کو ہرگز خارج از مکان نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور بقول غالب انھوں نے اپنا طرزِ خاص اس لیے ترک کیا کہ اسے "یاروں نے چلنے نہ دیا۔" (جلوئے شعر) دراصل حقیقت وہی تھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ تین پشتوں کے تجربے نے انھیں بتا دیا تھا کہ ان حالات میں زندہ رہنے ہی کے نہیں بلکہ سرِ برآوردہ طور پر زندہ رہنے کا کیا طریقہ ہے۔ سو انھوں نے اپنی متاعِ شعر و سخن کو اپنا واحد ہتھیار سمجھتے ہوئے اس سے وہی کام لیا جو احمد بخش خاں نے اپنی وہمیلی، انگریزوں سے ساز باز اور اپنی دنیا داری، چالاکی اور ہوشیاری سے لیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنے دور میں طبقہٴ امرا و خواص سے منسلک رہے بلکہ بادشاہ تک سے قربِ خاص کے دعوے دار ہو گئے اور دنیائے شعر و ادب میں اپنے لیے ایسا بڑا شان و شوکت ایوانِ تعمیر کیا کہ جس کی آب و تاب رہتی دنیا تک قائم رہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر یون کمار و دیا کی رائے بھی دیکھ لیں کہ وہ اس تبدیلی کو کس نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی مشہور تصنیف "غالبِ شخصیت اور مہد" میں تحریر کرتے ہیں "تاہم آخر الامر ایسا لگتا ہے کہ اس وقت جب کہ وہ دنیائے شاعری میں

نئے نئے متعارف ہو رہے تھے، انھوں نے رائے عارف کو خاطر میں نہ لانے کے اپنے رجحان کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر اپنی ادبی پزیرائی کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ ایک مصافی مصالحت بھی تھی اور نکتہ چینیوں کے خطر و تعریض کی ایک حد تک معقولیت کا بادل، تا خواستہ اقرار بھی۔“ (ص ۱۱۹) گویا انھیں زندہ و تابندہ رہنے کے لیے اور اپنی متاع کو فنا ہونے سے بچانے کے لیے یہ مصالحت لازمی تھی۔ سو وہ مصالحت انھوں نے بڑے حقد و مزہ سے کی اور جریدہء عالم پر اپنے لیے نقش دوام چھوڑ گئے۔ ہم اس کو چاہے ان کی ترقی پسندی سے تعبیر کریں یا بیدار مغزی سے، فراست سے یا ذکاوت سے حلیت میں یہ ان کی وہی چھٹی حس تھی جو ان کو ان کے بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی اور جو عمومی طور پر تحفظ ذات کے لیے فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔

انتا سے غالب کے عنوان کے تحت صاحب آغا ر غالب نے غالب کی اس بیدار مغزی اور ترقی پسندی کا ایک اور بھی ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ انھوں نے تقریباً ۲۸ سال کی عمر میں اپنے عزیز دوست اور برابر نسیتی علی بخش خاں کے لیے ان کی استاد پر فارسی مکتوب نگاری پر جو مختصر رسالہ صرف تین دن میں تحریر کر کے مکتوب نگاری کا ایک انتہائی ترقی پسند دستور العمل پیش کیا اس سے بھی ان کی چٹنی پختگی اور بیدار مغزی کا ثبوت ملتا ہے۔“ اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط و کتابت کا جو نقیص اسلوب مرزا نے تمیں برس بعد اردو زبان میں اختیار کیا اور جس سے ان کے اکثر فارسی خطوط عاری ہیں اس وقت بھی انھیں پسند خاطر تھا۔“ یہاں ایک انتہائی معقول سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب غالب نے اٹھائیس سال کی عمر میں خطوط نگاری کا ایک ترقی یافتہ دستور العمل خود مرتب کر دیا تھا تو انھوں نے اس پر تیس سال تک عمل کیوں نہیں کیا۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ ہجرت پور کے محاصرے میں جب وہ منزل کا برسرِ سر کے لشکر کے ساتھ اپنے سالے علی بخش خاں اور چچا سر احمد بخش خاں کی مصیبت میں یہ دستور العمل مرتب کر رہے تھے اور ابھی اس دستور العمل کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے سفرِ کلکتہ کے دوران اپنے خطوط میں

اس دستور العمل کی کھلی خلاف ورزی شروع کر دی اور یہ خلاف ورزی ہمہۂ وقتہ آجندہ تیس سال جاری رہی تاوقتیکہ انھوں نے خود اردو میں مکتوب نگاری کا ایک نیا اسلوب جو سلاست بیان اور راست مدعا نگاری میں ان کے دستور العمل سے ہم آہنگ تھا، اختیار نہیں کر لیا۔ اس سوال کا جواب چوں کہ قدرے طویل اور ذریعہ نظر مقالے کے محیط سے باہر ہے اس لیے فی الوقت اس سے صرف نظر کر کے ہم اپنی توجہ غالب کی طبعی انفرادیت، ترقی پسندی، بیدار مغزئی، حیات پرستی، فراست و ذکاوت تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت کی یہ خصوصیات ثابت کرتی ہیں کہ وہ ذہنی طور پر اپنے وقت سے بہت آگے تھے۔

اس ترقی پسندی کا پہلا مظہر تو ان کی انفرادیت اور جدت پسندی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لڑکپن میں ان کا رجحان ظہور کی اور ہیڈل جیسے شعرا کی طرف تھا۔ اردو کی ابتدائی شاعری بھی اس ہی انفرادیت اور جدت پسندی کا شاخصہ نہ تھی۔ پھر یہ جدت پسندی اور انفرادیت بھی اس انتہا کی تھی کہ لکری میدانوں کو پار کر کے خارجی دنیا پر بھی حاوی تھی۔ ان کی بول چال میں نشست و برخاست میں، لباس میں، کھانے پینے میں غرض یہ کہ ان کے اکثر خارجی رویے بھی عمومی رویوں سے بالکل مختلف اور منفرد تھے۔ وہ اس وقت پاپارخ اور سٹار کرتے تھے جب کوئی دوسرا نہیں اڑھتا تھا۔ وہ لنگی جو وہ سر پر باندھتے تھے وہ بھی عام دلی والوں کی طرز سے مختلف ہوتی۔ انھوں نے اپنے چہرے کی ہیئت میں بھی دوسروں سے ہمیشہ امتیاز رکھا۔ یعنی جب ڈانڈمی رکھی تو سرمندہ دایا۔ انھوں نے سرمید کو اس وقت آئینہ اکبری کی تصحیح پر تقریباً لکھنے سے انکار کر دیا جب کہ ان کے ذاتی تعلقات نہ صرف سرمید سے بلکہ ان کے خاندان سے نہایت گہرے تھے اور ان کے اس کام کو یک لخت مسترد کر دیا۔ اور مسترد صرف اس اصول پر کیا کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے آئین و قوانین و ایجادات کے سامنے پچھلے سارے آئین و تقویم پارینہ ہو چکے ہیں اور اس انکار پر لوگوں سے آفریں طلب بھی ہو۔

گرچہ میں کاریں مکیم آفریں

جائے آں وارو کہ ۵۰ یج آفریں

غالب کی جذبات پسندی کو مزید ہمیزان کے سفر و قیام کلکتہ سے بھی ملا۔ وہاں انھوں نے ایک منظم معاشرہ دیکھا، ذاک و تار کا نظام دیکھا، دفاعی جہاز دیکھے اور انگریزوں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کو پورے زور شور سے کام کرتے دیکھا۔ سر ڈکن نے ۱۷۹۱ء میں بنارس میں ہندو شکریت کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی۔ آگرہ کالج ۱۸۲۳ء میں قائم کیا گیا اور بعد میں بمبئی، بنگال اور مدراس تینوں پریزیڈنسیوں میں یونیورسٹی کی ابتدا ہوئی۔ ۱۸۲۳ء سے ۱۸۸۷ء تک دہلی کالج دانش جدید کا مرکز بن گیا۔ سی ایف اینڈریوز کہتے ہیں "کالج میں اردو، عربی اور فارسی ادب کے لیے ایک علاحدہ اور فٹل یعنی مشرقی شعبہ بھی تھا جس کو ۱۸۳۸ء تک اپنے نصاب کی جامعیت کے لحاظ سے انگریزی شعبے سے برابری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ یہ شعبہ نہایت مقبول تھا اور جدید انگریزی علوم کی تحصیل کے لیے طلبہ ان جماعتوں کو جہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا چھوڑتے نہیں تھے۔ فارسی اور عربی میں طلبہ کی جس معیار تک رسائی ہوتی تھی وہ بہت اونچا تھا۔ ممتاز مشاہیر ادب مثلاً نامور شاعر الطاف حسین حالی اردو کے مسلم الثبوت نثر نگار، نذیر احمد، عربی کے ممتاز فاضل مولوی، ضیاء الدین مورخ اور بے شمار تصانیف کے مترجم مولوی ذکاء اللہ اور ادبی تنقید کی کتاب 'آپ حیات' کے مصنف محمد حسین آزاد کا تعلق اسی مشرقی شعبے سے تھا۔ تعلیم جدید کی اس یلغار نے غالب پر واضح کر دیا کہ اولاً فارسی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ دوم اسلوب نگارش میں اب سلاست کا دور آنا وقت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور قائم و دائم اور زندہ و پاکدہ رہنے کے ابدی قانون کے مطابق انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان سے دو ٹوٹ نکال کر وقت کی ہدایت کو قبول کر لیا۔ چنانچہ کلکتہ کے قیام کے دوران ان کے ایک عزیز دوست سراج الدین احمد کے ایما پر، جن کا اخبار آئینہ سکندری سے بھی تعلق تھا اور جن کے نام غالب کے بہت سے فارسی مکتوبات ہیں یہ انتخاب کلام اردو فارسی عمل میں آیا اور اس انتخاب کا نام گل رعنا رکھا گیا۔ چون کہ اردو دیوان ان کے سفر کلکتہ سے پہلے ہی مرتب ہو چکا تھا، اس لیے اردو انتخاب ردیف دار بھی ہے اور جن

نوازوں پر مشتمل ہے ان کی تعداد بھی زیادہ یعنی ۷۱۱ ہے۔ اس کے مقابلے میں فارسی کلام کا دائرہ بہت محدود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفر کے زمانے تک انھیں فارسی میں شعر گوئی کی طرف توجہ زیادہ ہوئی ہی نہیں تھی۔“ (ذکر غالب۔ مالک رام ص ۱۶)

آئیے اب غالب کے دوسرے فیصلے کو دیکھتے ہیں۔ یعنی آغا میر سے ملاقات کو۔ ”مرزا جب لکھنؤ پہنچے تو وہاں غازی الدین حیدر بادشاہ تھے۔ اپنے والد نواب سعادت علی خاں کی وفات کے پانچ سال بعد تک وہ نواب وزیر ہی کہلاتے رہے لیکن ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہسٹنگو نے شاہ دہلی کی کسی بات سے بگڑ کر نظام حیدر آباد اور نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ حضور نظام نے مظاہر بادشاہ کے احرام کے خیال سے نہ مانا لیکن غازی الدین حیدر نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور ۱۸۱۹ء میں بڑی دھوم دھام سے ان کی تخت نشینی ہوئی۔ جس کی تاریخ بھی۔ بھونچ کہ عمل اللہ کر دیہ... جب غالب لکھنؤ پہنچے تو بادشاہ کی خدمت میں ہارباہی کے لیے انھیں نائب السلطنت معتمد الدولہ آغا میر کی مدد کی ضرورت تھی جنھوں نے آغا ملازمت خانہاں کی حیثیت سے کیا تھا لیکن نواب حکم اور ریزنڈنٹ کی مدد سے بادشاہ پر اس قدر اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ اب وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جیسا کہ غالب کے خطوں سے پتا چلتا ہے ان کی نیابت تاریخ اودھ کا ایک نہایت تاریک باب ہے۔ مرزا نے ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک نثر صنعت تعطیل میں لکھی۔ لیکن اس نثر کے پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملاقات کے لیے غالب نے جو شرطیں پیش کیں انھیں مرزا باعث شرم و خلاف خودداری سمجھتے تھے۔ چنانچہ خود اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ”آنجہ در باب ملازمت قرار یافت خلاف آئین خودداری سمجھتے تھے۔ چنانچہ خود اپنے ایک خط خاکساری یوں۔ ”مرزا بقول خود اس وقت نو آموز شیوہ گدائی تھے اور شاہان اودھ کی تعریف میں سے پہلا قصیدہ جو انھوں نے لکھا ہے اس میں بار بار اس امر کی طرف اشارہ ہے۔“

نثر پروردہ خلوت مر آزاد گم

کافر مگر بسرا پروردہ سلطاں رفتم

من ہم از خیل کریم و بخت نمود
گر بدرخیزد چراغ کریمیاں رستم

(آثار غالب، طبع محمد اکرام۔ ص ۱۷)

لیکن اس ضمن میں مالک رام، حالی کا حوالہ دیتے ہوئے ”ذکر غالب“ میں یہ تحریر کرتے ہیں: ”مرزا آغا میر کی خدمت میں جانے کو تو راضی ہو گئے لیکن قبول حالی انھوں نے اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اول میرے چٹختے پر آغا میر میری تعظیم دیں یعنی اپنی جگہ کمزے ہو کر پڑرائی کریں۔ دوم یہ کہ مجھے نقد نذر دینے سے معاف رکھا جائے۔ بلکہ غالب یہ چاہتے تھے کہ آغا میر ان سے معاف بھی کریں۔“ گدا طبع سلطان صورت ”آغا میر اعزاز و اکرام کی اس حد تک جانے پر راضی نہ ہوا۔ اور مرزا اس سے کم کو آئین خورشید واری کے خلاف اور شیوہ خاکساری کے لیے تنگ خیال کرتے تھے اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔“ (ص ۶۱)

پران کمار دورما اپنی مشہور تصنیف ”غالب شخصیت اور مہد“ میں اس ملاقات کی بابت لکھتے ہیں: ”مرزاں کو تھقی کی طرف سے شرطوں کا عائد کیا جانا اچھا نہیں لگا۔ ایسا لگتا ہے کہ نواب سے ملاقات کی کوئی شکل نہ نکلنے کے بعد غالب کو اس مہم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یہ واقعہ غالب کی زندگی میں سر پرستانہ انداز کے سرچشموں کی تعظیم و تکریم پر آمادہ کرنے والی ان کی مالی حالت اور ایک شاعر اور طبیب امرا کے رکن کی حیثیت سے اپنی قدر و قیمت پر ان کے اس یقین کفی کے درمیان کش مکش کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے جس کی رو سے غلامانہ ذہنیت کا کوئی بھی اظہار ان کے لیے باعث ذلت تھا۔ یہ کش مکش اکثر انھیں اظہار احرام میں جھکنے کے تمام مراحل سے گزارتی لیکن لہ آخر میں وہ ہار سیدھے کمزے ہو جاتے۔“ میرے خیال میں اس ملاقات کی ناکامی پر اس سے بہتر شرح نہیں ہو سکتی۔

اب آئیے غالب کے آخری فیصلے پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس واقعے کے بارے میں صاحب یادگار غالب تحریر کرتے ہیں: ”تذکرہ آب حیات“ میں لکھا ہے کہ جب ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا۔ مسٹر ہامن سیکرٹری گورنمنٹ ہند مدرسن کے

امتحان کے لیے دلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو رہا ہے ماہوار کا ایک عربی مدرسہ کالج میں مقرر ہے اسی طرح ایک فارسی مدرسہ مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا غالبؒ، موسیٰ خاں اور مولوی امام بخشؒ کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا کو بلایا گیا۔ مرزا پاکی میں سوار ہو کر صاحب سیکرٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ انھوں نے فوراً بلالیا۔ مگر یہ پاکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے مطابق صاحب سیکرٹری ان کو لینے آئیں گے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ہو گیا کہ اس سبب سے نہیں آئے تو وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں آئیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا کہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز یکم زیادہ ہو جسے اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا نے کہا مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور یہ کہہ کر چلے آئے۔“ (ص ۲۹ یادگار غالب) صاحب آثار غالبؒ نے بھی یہ واقعہ من و عن اسی طرح نقل کیا ہے بجز اس کے کہ انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ غالبؒ نامن سے ملنے کہاں پہنچے۔ یعنی وہ جگہ جہاں وہ ملنے گئے وہ ان کا دفتر تھا یا بقول حاتیؒ ”سیکرٹری صاحب کا ڈیرہ“۔ البتہ مالک رام نے ”ذکر غالبؒ میں اس واقعہ کا سنہ ۱۸۴۰ء لکھا ہے اور حاشیہ میں اس حقیقت کی صراحت بھی کی ہے کہ حاتیؒ نے آزاد کا لکھا ہوا سال نقل کر دیا ہے جو غلط ہے۔ صحیح ۱۸۴۰ء ہی ہے جو ”مرحوم دہلی کالج“ میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔ اس بات کے علاوہ وہ دوسری اہم بات یہ کہ انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ”یعنی مرزا غالبؒ اگلے دن ان کے بنگلے پر پہنچے“۔ گویا وہ جگہ جہاں غالبؒ ان سے ملنے پہنچے وہ سیکرٹری نامن کی اقامت گاہ تھی کالج کا دفتر تھا۔ یہ تفصیل اس لیے ضروری ہے کہ دونوں جگہ پر استقبال کے مختلف آداب ہیں۔ باقی تفصیلات دوسرے سوانح نگاروں کے ہاں بھی دی ہیں جو حاتیؒ نے یادگار غالبؒ میں بیان کیں۔

نامن کے رویے پر میرا ذاتی ردعمل تو یہ ہے کہ اس کا رویہ دنیا کی مسلمہ اور مہذب

اقدار و آداب کے بالکل خلاف تھا اور وہ اس لیے کہ غالب ان سے ملاقات کے لیے ان کی جائے اقامت پر گئے تھے۔ اگر وہ جگہ سرکاری دفتر ہوتی تب تو شاید نامن کے رویے کا کوئی جواز نکلتا تھا جب کہ اس صورت میں ہرگز نہیں نکلتا۔ مزید برآں میں یہ کہنا بھی پسند کروں گا کہ یہ ”صاحب لوگ“ جو ایک نئے معاشرے کی بنیادیں استوار کر رہے تھے ایک زوال آشیاء جاگیردارانہ معاشرے کی پرانی اقدار سے بھی آشیاء تھے اور ان کو لندن سے ہندوستان آنے سے پیشتر زبان و ادب ہی نہیں برسوں یہاں کے ادب و آداب بھی سکھائے جاتے تھے۔ جب وہ یہاں کی سماجی اقدار سے کلیتہً واقف تھے تو ان کو غالب کے علمی و ادبی مرتبے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وہ ساری رعایات دینی چاہیے تھیں جس کے وہ حق دار تھے۔ اب غالب کی طرف سے دیکھا جائے تو ان کا فیصلہ سو فیصد درست تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اپنے معاشرے میں ایک نامور شاعر کی حیثیت سے تو وہ کسی مرہی کی سرپرستی یا طبقہٴ امرا میں سے کسی کی کفالت قبول کر سکتے تھے لیکن کسی کالج میں ملازم ہو کر مدرسے کا تصور ہی چوں کہ آشیاء اور اجنبی تھا اس لیے اس کو وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

یہاں انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحب آثار غالب کے ان الفاظ پر جو انھوں نے اس واقعہ کے نفسیاتی تجزیے کے طور پر لکھے ہیں اس مقالے کو ختم کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں ”بعض لوگ حیران ہیں کہ مرزا جو عام پیمائشوں اور معمولی حصہ یوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے اور خوشامد و متعلق کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے وہ حکومت ہند کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے استقبال نہ کرنے سے کیوں اس قدر چراغ پا ہو گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا جدید قصائد میں جو ایک طرح کا مبالغہ روا رکھتے اس کو وہ ایک شاعرانہ رسم سمجھتے تھے جسے شروع سے سب شاعر ہاتھ آئے ہیں اور انگریز افسروں کی تعریف میں ان کے قصائد منظوم عرفیاں ہیں جنھیں زیادہ موثر بنانے کے لیے مرزا نے بجائے نثر کے نظم میں لکھا ہے۔ وہ طبعاً خود دار و حساس تھے اور خاندانی اعزازات کی ایک ایک بات پر جان دیتے تھے اور اس لیے ہر وہ عمل جو ان کے معاشرتی منصب کی تنقیض کرتا ان کے لیے قابل برداشت نہ تھا۔“

کتابیات

- ۱۔ ”کلیاتِ شعر“ قالبؔ ع ۱۳۸۷ء مطبع نول کشور
- ۲۔ ”قالبؔ شخصیت اور عہد“۔ چان کمار ورما۔ (ترجمہ سامہ فاروقی) ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد نومبر ۱۹۹۹ء
- ۳۔ ”ذکرِ قالبؔ“۔ مالک ماسم۔ مکتبہ شعر و ادب سن آؤلا اور
- ۴۔ ”یادگارِ قالبؔ“۔ سولانا الطاف حسین حالی۔ ادارہ یادگارِ قالبؔ کراچی۔ نکس بازارِ قلات ع ۱۹۹۷ء
فضلی پرنٹرز کراچی
- ۵۔ ”۳۰ قالبؔ“۔ شیخ محمد اکرام۔ ناشر: شیخ فخر احمد۔ محمد علی روڈ، بسین، چوٹا ایجن
- ۶۔ ”قالبؔ“۔ دہلی پری گارین۔ دانیال عبداللہ۔ بارہن روڈ، کراچی، اشاعت ازل ۱۹۹۸ء

نیاز فتح پوری کی ”مشکلاتِ غالب“

کراچی کے ایک سینما میں نیاز فتح پوری کی نگارشات برائے فروخت تھیں۔ اس کا اہتمام شاید اردو ڈسٹری بیوٹ نے بطور خاص کیا تھا۔ ان کتابوں میں سے ایک کتاب ”مشکلاتِ غالب“ کہ قبیح اور وزفا قاضی برداشت تھی۔ میں نے بھی طریقہ لی اور میں اس کتاب کو دکانِ فوٹو عتار با اور اس طرح میں نے غالب کے ان منتخب اشعار کی اس شرح سے آگاہی حاصل کی جو نیاز صاحب نے کی تھی۔ اس مطالعے کے دوران بعض بچہوں پر مجھے کچھ اشیہا ہات نظر آئے۔ بعض جگہ مطالب میں ہماری ہم آہنگی نہیں تھی اور بعض جگہ مجھے نیاز صاحب کی طرزِ فکر ہی سے شدید اختلاف تھا۔ چنانچہ ذیل کے مضمون میں میں نے ان تمام خیالات کا اظہار کیا ہے کہ جہاں مجھے موصول سے کسی قسم کا بھی اختلاف تھا اور یہ سب ایک عام قاری کی حیثیت سے۔ اس میں نہ کسی قسم کی علیت کا دعویٰ ہے اور نہ ہی غالب جہی کا۔ لیکن اردو ادب کے ایک عام طالب علم کی حیثیت سے چوں کہ مجھے بھی اپنی بات کہنے کا حق ہے، سو کہہ رہا ہوں۔

۱۔ - دھم نے داد نہ دی تھی دل کی یارب

تیر بھی سینہ بہل سے پڑ افشاں نکلا

غالب نے خود بھی اپنے شعر کی تشریح کی ہے اور کہا ہے ”دھم تیر کی توہین پہ سب ایک رخنہ ہونے کے اور تم کواد کے دھم کی تحسین پہ سب ایک طاق ساکمل جانے کے ہوتی ہے۔ تیر تھی دل کی داد کیا دیتا وہ تو تھی دل سے گھبرا کر پڑ افشاں اور سراپہ۔ نکل گیا۔

نیاز صاحب نے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے تنگ دل پر بجا طور پر زور دیا ہے کہ پورے شعر میں ساری مضمون بندی و خیال آرائی اس ہی لفظ کے اوپر ہے لیکن اس وضاحت کے ساتھ ہی یہ جملہ لکھ کر ”میری تنگ دل کا یہ عالم ہے کہ تیر بھی اس کے اندر سے پروں سمیت نہ نکل سکا اور پروں کو دل ہی میں چھوڑ گیا“ اپنی ساری زبان دانی اور شعر مہمی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ یہ جملہ نیاز فتح پوری جیسا شخص کس طرح لکھ سکتا ہے۔ میں یہ بھی ماننے کو تیار نہیں کہ نیاز صاحب پرافتخاں کے معنی نہیں جانتے تھے۔ بہر طور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ”پروں سمیت نہ نکل سکا اور (نہ) دل ہی میں چھوڑ گیا“ کا مفہوم نیاز صاحب نے اس شعر میں کہاں سے داخل کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جملہ نہ صرف یہ کہ انتہائی غیر ذمے داری کا جملہ ہے بلکہ ان کے شایان منصب بھی نہیں۔ جب کہ بات صرف اتنی ہے کہ محبوب کا تیر دل کے پار ہو گیا ہے۔

۲۔ تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا

اڑنے سے چھتر بھی مرا رنگ درد تھا

اس شعر کی شرح کرتے ہوئے بھی نیاز صاحب نے ایک جملہ غیر ضروری لکھ دیا ہے ”کاروبار حیات میں مجھے کبھی خوشی حاصل نہ ہوئی۔“ اگرچہ رنگ کے درد ہونے اور زندگی میں کھٹکا لگا ہونے سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے لیکن یہ غالب کے شعر کی شرح نہیں ہوگی۔ مثبت شرح صرف اس قدر ہی ہے کہ میرا رنگ جا بھگی میں موت کے ڈر سے درد نہیں ہوا۔ مجھے تو ساری زندگی اپنی موت یاد رہی۔

۳۔ ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب

خون جگر دو دینے مڑگان پار تھا

اس شعر کی شرح نیاز صاحب نے اس طرح کی ہے۔ کہتے ہیں خون جگر صرف مڑگان پار کی امانت تھا اور اسی کے لیے یہ خون بہنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا اور میں نے دنیا کے اور بہت سے غموں میں بھی خون کے آنسو بہائے نتیجہ یہ ہوا کہ جب مڑگان پار

نے اس امانت کا حساب مجھ سے لینا چاہا تو مجھے پھر از سر نو خون کے آنسو بہانا پڑے اور اس امانت کو اس طرح واپس کیا۔“

یہ شرح انتہائی Simplistic معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ محبوب نے شاعر کو کوئی امانت دی اور کہا دیکھو اس کو کہیں اور نہ خرچ کر لیتا۔ لیکن دنیاوی ضرورتوں نے شاعر کو اس طرح مجبور کیا کہ وہ امانت خرچ ہو گئی۔ اب جو محبوب نے اپنی امانت مانگی تو شاعر نے (گویا کہیں اور سے ادھار لے کر) اس کا پورا کیا۔ اگر اس ہی سہل خیال کی جڑی کی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ ساری امانت ”دنیا کے دوسرے غموں میں“ پہلے خرچ ہو چکی تھی تو پھر از سر نو خون کے آنسو کس طرح بہائے۔ اس خیال کو مد نظر رکھتے ہوئے یہاں امانت کی شرح اس طرح نہیں ہو سکے گی۔ جس طرح نیاز صاحب نے کی ہے۔ یہاں اس کی شرح صرف اس قدر کافی ہے جتنی حاتی نے یادگار غالب میں کی ہے۔ یعنی یہ کہ خون جگر کا قطرہ قطرہ آنکھوں سے اس طرح بہا دیا گویا (یہ میرے جگر کا خون نہ تھا بلکہ) مڑگان یار کی امانت تھی جو اس کو واپس کر دی۔

۳۔۔۔ دماغِ عطرِ جبرائیل نہیں ہے

غلمِ آوارگی ہائے صبا کیا

نیاز صاحب نے دماغ کے معنی صرف برداشت اور تاب و توان کے لکھے ہیں جب کہ اس کے معنی ذوق اور میلان کے بھی ہیں۔ دوسرے انھوں نے شعر کی تشریح سے پہلے سوال اٹھایا ہے کہ یہاں جبرائیل کس کا مراد ہے یعنی اپنا یا محبوب کا۔ پھر بعد میں فیصلہ کرتے ہوئے کہ یہ جبرائیل محبوب کا ہے یہ تشریح کی ہے کہ اگر صبا کی آوارگی جبرائیل محبوب کی خوشبو کو ادھر ادھر لیے پھرتی ہے تو ہمیں اس کا غم کیوں ہو جب کہ ہم میں اس خوشبو سے لطف اٹھانے کی تاب ہی نہیں۔ میرے خیال میں شعر کی یہ تشریح غالب کے پورے کلام ہی کی مختصص نہیں بلکہ اس پندار کی بھی تو ہیں ہے جو غالب کے کلام کا ایک بڑا وصف ہے۔ غالب نے اپنی کمزوری کا اظہار کر کے نہ عشق میں اور نہ ہی ذاتی زندگی میں جالوی حیثیت پر اکتفا گوارا کیا۔ چنانچہ شارح سے غالب کے کلام کے بنیادی اوصاف کی

بقا پر اختلاف کرتے ہوئے نیز شاعری میں عشق کی روایات کو مبد نظر رکھتے ہوئے مجھے یہ بات زیادہ قریب قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہاں دماغ کے متنی میلان کے لیے جائیں۔ ان متنی کے ساتھ شعر کا مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی مباح محب کے ہر بہن کی خوشبو اذاتی پھرے (اور اغیار اس سے فیض حاصل کرتے رہیں) مجھے کیا غم۔ مجھے یہ خوشبو (جو ستم کشی کی بھی ہو سکتی ہے۔ بے وقائی کی بھی ہو سکتی ہے اور وصل غیر کی بھی) ہی اچھی نہیں لگتی۔

۵۔ ۔ گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا

گھر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

شارح نے اس کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ میرے شوق محبت کی شدت و وسعت کا یہ عالم ہے کہ دل جیسی چیز میں بھی (جو وسعت دو جہاں اپنے اندر رکھتا ہے) نہیں سا سکتا تھا لیکن مجبور اسے دل کے اندر سانا پڑا۔ گویا یوں کہیے کہ ایک اضطراب تھا دریا کا جو گھر کے اندر بند ہو گیا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غالب اپنے عشق میں وحشت میں بے چارگی میں، رقابت میں کوئی ثانوی حیثیت قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ چنانچہ ان کی یہی افتاد طبیعت جا بجا ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس بنیادی چیز کو آپ ذہن میں رکھیں تو اس شعر کا مطلب عین غالب کی نفسیات کے مطابق کہ ہر کس و نا کس کے ساتھ مرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے یہ ہو گا کہ باوجود اس کے کہ سمندر کا اضطراب (یہاں دریا۔ گھر، آب گھر جیسے سارے، طغانات کو نظر میں رکھیں) ایک گھر میں سا جاتا ہے لیکن میرے شوق کی یہ کیفیت ہے کہ دل میں بھی اس کو تنگی محسوس ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر میرے شوق کی شدت و وسعت سمندر سے بھی زائد ہے۔

۶۔ ۔ کوئی دیرانی سی دیرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غلام صاحب لکھتے ہیں "میں گھر کی دیرانی سے گھبرا کر صراخ کیا۔ لیکن وہاں بھی وہی گھر کی سی دیرانی دیکھی۔ اس شعر میں بقول حالی صرف یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دشت اور گھر کی دیرانی بالکل ایک سی ہے۔ لیکن اس شعر میں حسن اس وقت پیدا ہوتا جب یہ ظاہر کیا جاتا

کہ میرا گھر دشت سے زیادہ ویران ہے۔ لیکن لفظ ”میں“ نے یہ مفہوم پیدا نہ ہونے دیا۔ مجھے پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ اس شعر میں کسی طرح یہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا کہ میں گھر کی ویرانی سے گھبرا کر صرا گیا۔ یہ پورا جملہ ”ایزاد بندہ“ سے زیادہ کچھ نہیں۔ رہا سوال شعر کے حسن کا تو میں سمجھتا ہوں کہ اگر گھر کو آبادی کی نشانی ہے دشت سے کہ ویرانی کی علامت ہے، مماثل ہو جائے تو ویرانی کی شدت کا خاطر خواہ اظہار ہو جاتا ہے۔ اسی گھر کی ویرانی کہ دشت سے مماثل ہو اظہار ویرانی کے لیے کافی ہے۔ یہاں یہ بات بھر طوطا خاطر رہے کہ یہاں بھی غالب نے دشت کو ویرانی میں اپنے گھر سے بڑھنے نہ دیا۔ چنانچہ اس کا بہترین مفہوم وہی ہے جو حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے یعنی ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی مگر دشت بھی اسی قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آ جاتی ہے۔

۷۔۔۔ وا کر دیے ہیں شوق نے بنو نقاب حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

شارح لکھتے ہیں ”میرے جذبہ شوق نے حسن کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے اور اب اس کے مطالعے کے لیے اگر کوئی چیز حائل ہے تو صرف نگاہ۔ غدا یہ کہ تجاہات حسن دور ہونے کے بعد ہی حسن کا صحیح مطالعہ ہو سکتا ہے۔“ اس شرح میں پہلا جملہ تو شعر کی سلیس نثر ہے۔ دوسرا جملہ اس ہی نثر پر ایک کلیہ ہے جو سراسر پہلے جملے کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں۔ اس شرح میں مجھے پہلا اعتراض تو لفظ ”مطالعہ“ پر ہے اس کی جگہ مشاہدہ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعر کا مفہوم کیا ہے۔ یہ شارح نے کہیں بیان نہیں کیا۔ دراصل اس شعر کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ذات ہر مشاہدہ حق میں شامل رہتی ہے۔ اس لیے انسان کو معروضی طور پر کبھی مکمل مشاہدہ حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال کو حافظ نے اس طرح ادا کیا ہے۔

میان عاشق و معشوق چچ حائل نیست

تو خود حجاب خودی حافظ از میان بر خیز

۸۔ نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خاندان آرائی

سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زرداں پر

شارح نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے کافی طراوت سے کام لے کر یہ بتایا ہے کہ سفیدی سے یہاں مراد آنکھ کا نور ہے اور قلعی بھی دیواروں پر کی جاتی ہے۔ یوسف کی تشدد کی اور باپ کی مختلف آنکھوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن انتہائی قریب کی بات یعنی آنکھیں سفید ہو جانا بمعنی اندھا ہو جانا مذکور نہ ہوا۔ اردو کا یہ محاورہ اس شعر میں لفظ سفیدی کے ایہام کو اور بھی اچھی طرح بیان کر سکتا تھا کہ حضرت یعقوب نے بیٹے کی یاد میں رو رو کر اپنی بیٹائی کھو دی تھی۔ دوسرے قرآن کی آیت "وَبَيْضَتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزْنِ" کا ترجمہ بھی یہی ہے۔ اور (حضرت یعقوب) کی آنکھیں غم کے سبب سفید ہو گئیں۔

۹۔ کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ

دل فرو جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

شارح لکھتے ہیں کہ اس شعر کا مفہوم واضح نہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں حسرت اظہار کا گلہ کس سے کروں، جب کہ میرا دل ہی اظہار حال سے قاصر ہے۔ اس صورت میں زبان ہائے لال سے خود غالب کی گنگ زبان مراد ہوگی۔ لیکن اگر زبان ہائے لال سے مراد دوسروں سے ہو تو پھر مفہوم یہ ہوگا کہ جب لوگ میرا حال پوچھتے ہی نہیں تو پھر میں حسرت اظہار کا گلہ کس سے کروں۔ زیادہ قرین قیاس یہی مفہوم ہے کہ اس صورت میں زبان ہائے لال بہ صورت جمع استعمال کرنے کا کوئی محل نہیں ہے۔

اس تخریج کو پڑھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ "زبان ہائے لال" واقعی فصیح طرز اظہار نہیں لیکن اگر اس کا مطلب وہی لیا جائے جو نیاز صاحب کہتے ہیں تو "زبان ہائے لال" دستور زبان کے لحاظ سے ضروری ہو جاتا ہے اور اس لیے بے محل نہیں ہے۔

اس شعر پر کافی غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یوسف سلیم چشتی نے اس کی جو شرح لکھی ہے وہ بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انہونی یا محض

دل خوش کن، خیالی باتوں کو زبانی جمع خرچ کہتے ہیں لیکن مگوگی زبانیں اس زبانی جمع و خرچ سے قاصر ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ میں اپنی حسرت اظہار کا گلہ کس سے کروں کہ میرا دل کوٹنگوں کے زبانی جمع و خرچ کا دفتر ہے کہ ان کے (اظہار کی) آرزو میں اور تمنا میں سب دل ہی دل میں رہتی ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ چشتی صاحب سے بھی یہاں یہ ایک نکتہ نظر انداز ہو گیا۔ اور وہ نکتہ ایہام پر خیال آرائی سے متعلق ہے جو غالب کی شاعری کا خاصہ ہے اور جس پر خود چشتی صاحب بہت زور دیتے ہیں نکتہ یہ ہے کہ لال وہ بھی کھاتے ہیں جیسے جس پر جمع و خرچ کا حساب لکھا جاتا ہے اور حساب کتاب کی دنیا میں اس کا یہ رنگ صدیوں سے بطور کسی تبدیلی کے چلا آ رہا ہے۔ پھر زبان اور اس کھاتے میں صوری مماثلت بھی ہے اور آخر میں زبان سے متعلق محاورے مثلاً زبان بند ہونا اور زبان کھلنا بہ جہت کھاتوں کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

۱۰۔۔۔ ہے ہے خدا خواست وہ اور دشمنی

اے شوقِ منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے

نیاز صاحب اس شعر کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں ”شوقِ منفعل“ نور طلب ہے۔ اگر یہ ترکیب تو صلی ہو تو پہلا مصرع بے معنی سا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جب شوق خود محبوب کے خیالِ دشمنی پر منفعل ہے تو پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے کہ ”ہے ہے خدا خواست وہ اور دشمنی“ اس لیے اگر شوق اور منفعل دونوں کو علاحدہ علاحدہ رکھ کر منفعل کے بعد لفظ ہو محذوف تسلیم کر لیا جائے تو البتہ اپنی جگہ ٹھیک ہے اور اس صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ اے شوق تیرا خیال کہ محبوب حیراد دشمن ہے صحیح نہیں اور اس بدگمانی پر تجھے منفعل ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے دوسرا مصرع یوں ہو۔

اے شوقِ منفعل ہو تجھے کیا خیال ہے

نیاز صاحب کی تفسیر سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ مجھے شوقِ منفعل میں بظاہر کوئی اشکال نظر نہیں آتا۔ اگر شوقِ منفعل کے وہ معنی بھی لیے جائیں جو انہوں نے لکھے ہیں

حب بھی بات مکمل اور کسی طرح پہلا مصرع بے معنی نہیں ہوتا۔ یہ انفعال شوق تو ہے ہی بدگمانی کی وجہ سے۔ مثلاً اگر میں کہوں کہ "اے ایمان منغل تیرا کیا خیال ہے بھلا تیرا رب تیرے ساتھ دشمنی کرے گا۔" اس میں مجھے بتائیے اشکال کیا ہے اور کون سا جملہ بیکار یا بے معنی ہے۔ میرے خیال میں تو شوق منغل اتنی بلیغ ترکیب ہے کہ جو انسانی توقعات، محنت و محبت کی روایات، ذات محبوب کی خصوصیات اور پھر وقتی جذبات و تخیلات سب پر محیط ہے۔ پھر ایک بات اور بھی ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ انفعال اس دشمنی کی بدگمانی کا نہ کسی اپنی نارسائی کا بھی تو ہو سکتا ہے۔ پھر نیاز صاحب کس طرح کہیں گے کہ پہلا مصرع بے معنی ہو جاتا ہے۔ (دراصل وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ غیر ضروری ہو جاتا ہے) بے معنی کسی صورت میں نہیں ہوتا۔

۱۱۔ عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سی

میری وحشت تری شہرت ہی سی

اس شعر کے مفہوم میں کوئی اشکال نہیں لیکن نیاز صاحب کہتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں ردیف کا استعمال صحیح نہیں ہوا۔ موقع "میری شہرت تو ہے" کہنے کا تھا نہ کہ "شہرت ہی سی کا۔ بات تو کچھ ٹھیک ہی لگتی ہے۔ غالب کے ہاں کئی جگہوں پر ایسے اشتباہات موجود ہیں۔ مثلاً اوپر کے ایک شعر میں غالب کہتے ہیں کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ۔ اب یہ طرز اظہار ہی خلاف محاورہ ہے گلہ سنایا نہیں جاتا کیا جاتا ہے۔ یا غالب کا مشہور شعر ہے۔

میں وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی

کچھ ہماری خبر نہیں آتی

یہاں لفظ ہماری خلاف محاورہ ہے یہاں اپنی فصیح ہے۔ اسی طرح میری نظر ایک شعر پر ابھی پڑی جو اس طرح ہے۔

ترے خیال سے روح اجترار کرتی ہے

پہ جلوہ ریزی باد پہ پتہ نشان طبع

پہلے مصرع میں ح وزن سے خارج ہے۔ پر اس قسم کی چیزیں اساتذہ کے ہاں بھی مل جاتی ہیں جو ان کی بشریت پر ولایت کرتی ہیں لیکن ان کے منصب کی تکمیل نہیں کرتیں۔

۱۲۔ نگارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا

جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

نیاز صاحب کہتے ہیں ”اس حسن برق پاش کا نگارہ جس کا نقاب خود بہار ہو کون کر سکتا ہے۔ برق کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا اگر برق حسن کی جگہ جان حسن کہا جاتا تو زیادہ مناسب تھا“ لیکن میرے خیال کے مطابق ان معنی کے پیش نظر کہ انسان کی نگاہ کبھی ذات حقیقی تک نہیں پہنچ سکتی وہ ہمیشہ مظاہر ہی کو دیکھتی ہے لفظ برق ہی انتہائی پامعنی اور مناسب لفظ معلوم ہوتا ہے۔ یہ لفظ مناسب اس وجہ سے بھی ہے کہ برق کے سامنے چمک جھپک جاتی ہے اور مانع نگارہ ہوتی ہے۔

۱۳۔ اس چشم فسون گر کا اگر پائے اشارہ

طوبی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

شارح کہتے ہیں طوبی کے سامنے آئینہ رکھ کر اس کو بولنا سکھایا جاتا ہے۔ اس لیے طوبی کے ساتھ آئینہ کا ذکر تو درست ہے لیکن خود آئینہ کا چشم فسون گر کے اشارہ پر گفتار میں آ جانا لایعنی سی بات ہے۔ آئینہ کا گفتار سے کوئی تعلق نہیں بلکہ سکوت و حیرانی سے ہے۔ آئینہ کی حیرانی و سکوت کا چشم فسون گر کے اشارہ سے گفتگو میں تبدیل ہو جانا عجیب بات ہے۔

یہ غالب کا انتہائی خوب صورت شعر ہے۔ چشم، آئینہ، فسون گر، طوبی، گفتار، غرض یہ کہ اسے تلازمات کے ساتھ اتنی خوب صورت بات کہنا ہر ایک کے بس میں نہ تھا۔ یہ صرف غالب کہہ سکتا تھا لیکن مجھے حیرت ہے کہ نیاز صاحب اس خیال کو مہمل کہہ رہے ہیں۔ اگر یہ خیال مہمل ہے تو اردو اور فارسی کی نوے فیصد شاعری مہمل قرار پائے گی اور جو شاعری رہ جائے گی وہ ”وہما ان تو دروہا نتد“ کے مصداق ہی ہوگی۔

آئینہ اور طوطی کی رعایت ذہن میں رکھیے۔ اب سوچئے کہ شاعر کہتا ہے کہ اس کی آنکھ ایسی فسوں کر ہے کہ اگر اشارہ کرے تو طوطی تو کیا آئینہ کہ خود منظر حیرت ہے۔ یونے لگے۔ فارسی اور اردو شاعری کی بنیاد اس خیال آرائی پر ہی ہے اگر نیاز صاحب اس کو لایعنی کہتے ہیں تو ان سے غالب کے اشعار کی تفہیم پر بات ہی نہیں ہو سکتی۔ غالب کا کون سا ایسا شعر ہے کہ جو ایسی خوب صورت خیال آرائی سے عاری ہوگا۔ بلکہ اردو اور فارسی کے بہترین اشعار اپنے منصب سے گر جائیں گے۔ مثالیں دے کر میں بات کو طوالت نہیں دینا چاہتا لیکن اس ہی غزل کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

سائے کی طرح ساتھ بھر میں سرود و صبور

تو اس قدر دل کش سے جو گلزار میں آوے

نیاز صاحب کا اعتراض اگر اس شعر پر بھی لگایا جائے تو یہ کیا جاسکتا ہے کہ درختوں کا جو قائم ہوتے ہیں اور اس لیے قیام کی نشانی بھی، محبوب کے ساتھ بھرتا ہے معنی و لغو بات ہے۔

۱۳۔۔۔ نقشِ ناز بہت طراز بہ آغوشِ رقیب

پائے طاؤس چنے خمدِ مانی مانگے

اس جہجہ کے مفہوم کے بارے میں مجھے نیاز صاحب سے کسی قسم کا اختلاف نہیں یعنی یہ تشریح کہ محبوب رقیب کی آغوش میں ہے اور یہ ایسا مکروہ منظر ہے کہ اس کی تصویر کھینچنے کے لیے خمدِ مانی کے بجائے پائے طاؤس چاہیے بالکل درست ہے۔ لیکن چلتے چلتے اس تشریح کا آخری جملہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ "کیوں کہ پائے طاؤس بہت بد نما ہوتا ہے اور تصویر کے لیے کھد یعنی رقیب کا جسم بھی دیکھا بد نما ہوتا ہے۔" اس آخری جملے نے ساری تشریح کا ستیا ناس کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شارح کا تصور "بہت طراز بہ آغوشِ رقیب" یکساں ہے گویا محبوب چار سال کا بچہ ہے اور رقیب اس کو گود میں لے کر بازار کے کالے پر دے والے فوٹو گرافر سے تصویر کھینچوا رہا ہے۔ اس حالت میں تصویر کے نیچے کا حصہ بہت بد نما رہ جاتا ہے چوں کہ اوپر کے جتنے حصے میں محبوب ہے وہ خوش نما ہے،

بچے کے حصے میں رقیب کی نانگنیں ہیں اس لیے وہ بدلتا ہے۔ میں جہاں تک موصوف کے ذہن تک رسائی حاصل کر سکا ہوں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کا مطلب کچھ اور ہو۔ بہر صورت اس ساری تخریج میں ”مصرعے“ کی چیز یہ تصور کے بچے کا حصہ ہے جو حقیقتاً کچھ سے بالاتر ہے۔

۱۵۔ اُستی ہے نہ کچھ عدم ہے غائب

آخر تو کیا ہے، اے نہیں ہے

اس کی تخریج نیاز صاحب نے اس طرح کی ہے اس شعر میں غائب نے ردیف کا استعمال بڑی عذرت کے ساتھ کیا ہے چوں کہ اس زمین کی ردیف نہیں ہے اور ساری غزل میں نہیں ہے۔ نہیں ہے کی تکرار کی گئی ہے اس لیے غائب نے اپنا نام ہی ”نہیں“ ہے ”رکھا لیا۔ اور اسی سے مخاطب ہو کر پوچھ رہا ہے کہ اے تو وہ جو ہر بات میں نہیں ہے۔ نہیں ہے کہنے کے سوا اور کچھ نہیں کہتا یہ تو تاکہ تو خود کیا ہے۔

اس شعر کی مندرجہ بالا تخریج تقریباً تمام حدود اولہ شرحوں میں نظر آتی ہے بلکہ حیرت ہے کہ پورے پورے جملے ایک سے ہیں۔ نیاز صاحب نے بھی اکثر وہی جملے نقل کر دیے ہیں۔ مجھے اس شرح میں کلام ہے۔ میرے ذہن کے مطابق اس شعر کے صرف دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ اس کا پہلا مفہوم اگر خمیر تو کوتم کا دوا دہ کر دانا جائے تو یہ ہوتا ہے۔

۱۔ غائب اسی ہستی عدم وجود (بمطابق انسانی اور اک کے) سے خطاب کر کے کہتا ہے۔ اگر نہ ہستی ہے اور نہ عدم ہے تو اے خدا (جو نہیں ہے) تو تاکہ تو کیا ہے! اے نہیں ہے۔ ”نہیں ہے“ اپنا نام نہیں رکھا ہے بلکہ اس کا نام رکھا ہے کہ جو اس صفت سے نصف ہے۔ یعنی لامکاں ہے۔ موجود و غیر موجود کے اس مہانے میں غائب اپنا نام ”نہیں ہے“ کس طرح رکھ سکتا ہے کہ وہی تو موجود ہے اور سوال کر رہا ہے۔

۲۔ اس شعر کا دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے اور وہ اس صورت میں اگر دوسرے مصرعے میں لفظ تو کوتم خمیر تصور نہ کریں بلکہ حرف عطف۔ اس طرح پہلے اور دوسرے مصرعے کی تشریح اس طرح ہوگی۔ غائب اگر نہ کچھ ہستی ہے اور نہ کچھ عدم ہے تو اے ”نہیں ہے“ آخر

کیا ہے! اس مفہوم میں بھی، "نہیں ہے" غالب نہیں ہے بلکہ خدا ہے۔

۱۶۔ بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے

اس قدر ذوق نوائے مرغ بتاتی مجھے

اس شعر کی شرح نیاز صاحب مروجہ شرحوں کی طرح یوں کرتے ہیں۔ "نوائے بلبل
سننے کا شوق مجھے بار بار چمن کی طرف لے جاتا ہے چوں کہ وہ بھی میری ہی طرح زاری و
نالہ میں مصروف رہتا ہے لیکن میرا محبوب یہ دیکھ کر مجھ سے بدگماں ہوتا ہے لیکن کیوں کہ
اس کا سبب ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ محبوب یہ خیال کرتا ہو کہ غالب کو صرف
چمن کا شوق ہے۔ اگر اسے میری محبت ہوتی تو وہ صحرا کا رخ کرتا کسی گلشن کی طرف کیوں
جاتا؟"

جہاں تک شعر کی شرح کا تعلق ہے مجھے اس میں کوئی اشتہاء نظر نہیں آتا لیکن جہاں
محبوب کی بدگمانی کا اظہار کیا گیا ہے وہ نیاز صاحب جیسے ادیب کے شایان شان نہیں۔
دراصل شاعر کہتا ہے مجھے تو شوق ہم نوائی بلبل (مرغ بتاتی) باغ کی طرف لے جاتا
ہے لیکن محبوب کو گل کی وجہ سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں جذبہ رقابت گل سے ہے۔

۱۷۔ عالم غبار و دشت مجھوں ہے سر بسر

کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

نیاز صاحب لکھتے ہیں "دنیا کو لیلیٰ کے نقطہ نظر سے کب تک دیکھا جاسکتا ہے جب
کہ وہ دراصل دشت مجھوں کی غبار انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔ مدعا یہ کہ دنیا میں ناکامی
و دشت ہی اصل چیز ہے اور ظاہری مسود و نمائش بالکل بے بنیاد چیز ہے۔"

بھلا سوچے تو یہاں دنیا کو لیلیٰ کے نقطہ نظر سے دیکھنے کا مفہوم کہاں سے پیدا ہوتا
ہے۔ اور پھر مدعا کے ضمن میں ناکامی و دشت اور ظاہری مسود و نمائش کہاں سے در آتی
ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ نیاز صاحب نے یہ تفریح انتہائی غیر ذمہ داری سے
کی ہے اور جو مفہوم بتایا ہے وہ ہرگز ہرگز ان کے شایان شان نہیں تھا۔ یہ غالب کا انتہائی
خوب صورت شعر ہے جس میں حقیقت و آئینہ کی تصویر کشی ہے۔ طرۂ لیلیٰ ایک

آئیڈیل ہے۔ بلند نظری و بلند فکری ہے جب کہ دنیا کے حقیقت نگار وحشت بھٹوں ہے۔
نگار مایہ سوں کا ناکامیوں کا ایک کنایہ ہے۔ اور طرۂ لعلی فکر بلند کا استعارہ ہے۔ میرے
خیال میں طرۂ لعلی سے بہتر کنایہ کسی عاشق (بھٹوں) کی زبان میں انسانی آئیڈیل کا ہو
بھی نہیں سکتا۔

۱۸۔ نالہ سرمایہ یک عالم و عالم کف خاک

آسمان بیڑہ قمری نظر آتا ہے مجھے

اس کی شرح اس طرح کی گئی ہے ”قمری بھی خاکی رنگ کی ہوتی ہے اور قمری کا اظہار
بھی خاکستری ہوتا ہے اس لیے آسمان کو بیڑہ قمری قرار دیا۔ اور عالم کو کف خاک،
چوں کہ دنیا نام نالہ و زاری اور خاک اڑانے کا ہے اس لیے آسمان کو بیڑہ قمری ہے جو
خاکی رنگ کا ہوتا ہے۔ قمری کی آواز کو بھی نالہ ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایک بار مجھے لگا ہے کہ نیاز صاحب نے جو کچھ حوالہ شروح میں لکھا تھا وہ من و عن
نقل کر دیا ہے۔ ورنہ آسمان کو بیڑہ قمری کہنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بات تو مافی
جا سکتی ہے کہ قمری خاکستری رنگ کی ہوتی ہے (حالاں کہ میں نے جتنی قمریاں دیکھیں
ہیں وہ ساری کی ساری سفید رنگ کی تھیں۔ ممکن ہے ایران میں خاکستری رنگ کی بھی
ہوتی ہوں) لیکن اس کا اظہار بھی خاکستری رنگ کا ہو یہ خلاف واقعہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو
کالی مرفی کالا اور سرخ مرفی سرخ اظہار دیتی اور مودنی کے اظہار میں بھی وہ سارے رنگ
جھلکتے جو اس کے پردوں میں ہوتے ہیں۔ ہاں الہت خاک سے تلازمے کی ایک صورت
نکلتی ہے۔ جب مرفی بظہر سرخ سے جوڑا کھائے اظہار دیتی ہے تو اس اظہار کو خاکی اظہار
کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ آسمان ایسا ہی خاکی اظہار ہو۔ یعنی One Parent Product، پھر یہ
کہ مصرع کا آخری حصہ یعنی ”عالم کف خاک“ بھی توجہ کا طالب ہے۔ بھلا یہ آسمان اس
عالم سے باہر کی تو کوئی چیز نہیں ہے۔ اس میں شامل ہے۔ تو اس کو بیڑہ قمری کہہ کر کیا
مفہوم نکلتا ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ شرح آئی نہیں آپ سمجھ ہوں تو مجھے بتائیں۔
چاہے تھا کہ نیاز صاحب بھی جرأت سے کام لے کر کہہ دیتے کہ شعر کچھ میں نہیں آیا۔

غالب کے ایک دو تو نہیں دسیوں اشعار ایسے ہیں جن کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔
 فرض یہ چند اشعار تھے جن کی شرح میری نظر میں کل نظر ہے۔ بہت ممکن ہے جو
 مفہیم میں نے بیان کیے ہیں ان سے بھی لوگوں کو اختلاف ہو جو ہر قاری کا حق ہے۔
 میں نے بھی اپنے اس استحقاق کو استعمال کرتے ہوئے ہی یہ ساری باتیں کہی ہیں۔
 چنانچہ اس استحقاق کی حدود میں مفہوم کے اختلافات میرے اور نیاز صاحب کے ہیں وہ
 اپنی اپنی جگہ کہتا جائز ہیں لیکن مجھے خاص اعتراض ان معانی اور مفہیم پر ہے کہ جو ایک
 غیر ذمے دارانہ ذاتی رویے کی بنا پر مسلط کر دیے جائیں جب کہ شعر کے الفاظ اور سیاق و
 سباق دونوں سے کسی طرح ان معانی کی مناسبت نہ ملتی ہو۔ چنانچہ اپنے طور پر میں نے
 غالب کی تفہیم کی کوشش کی ہے۔ نیاز صاحب کی شرح پر یہ تنقید ضرور ہے ان کی تنقیص
 پر گز نہیں۔

غالب کی انشائی نگاری و فارسی نامہ نویسی

انشاء کے لغوی معنی:

لغت نامہ و تہذیب اللہ انشاء کے کم و بیش گیارہ مختلف معانی دیے گئے ہیں۔ ثبوت میں دیا گئے فارسی و عربی کے مستند ترین لغات کے حوالے دیے گئے ہیں اور اس طرح لفظ انشاء میں آفرینش و ایجاد، سخن پرداز، نوپندگی و تالیف عبارات سے لیکر ”خواندن و آوردن شعر از خوشبختی“ بھی شامل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے روایتی اور اصطلاحی معنی میں یہ لفظ تخلیقِ منشور کے فن ہی سے بحث کرتا ہے اور فنِ شعر کوئی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اب نثر میں یہ تخلیق قصہ کہانی کو چھوڑ کر ’منشآت‘، ’مکتوبات‘، ’رقعات‘، ’مراسلات‘، خطوط اور انشائے لطیف، کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ منشآت لغوی اعتبار سے منطقی کی جمع ہے اور انشاء کا صیغہ مفعول ہے جو مسودات، عبارات، تصنیفات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں ان سے مراد وہ تحریریں ہیں جو ادبِ عالیہ کہلاتی ہے۔ ان تحریروں میں انشاء پرداز نفسِ مضمون کو ایسے پُر شکوہ الفاظ، نادر تشابہ، استعارات اور بلندیِ افکار کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ عبارت میں حسن و تاثیر کے ساتھ زبانِ وافی، قدرتِ اظہار اور جزالتِ بیان بھی نمایاں ہوتی ہے۔ انشائے ابراہیم الفضل اور سہ نثر نگاری ان منشآت کے کلاسیکی نمونے ہیں۔

لغوی معنی کے لحاظ سے مکتوب اور منطقی میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اصطلاحاً مکتوب خط

یا رقعہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس میں ابلاغ، ترسیل یا ترسیل کا مفہوم نہیں ہوتا ہے جو بظاہر انشاء میں نہیں۔

آج کے اصطلاحی معنی کے مطابق رقعہات ذاتی نوعیت کے خطوط پر مشتمل تحریرات کا مفہوم رکھتے ہیں اور اسی سبب ان سے مراد دو ٹوٹتے ہیں جو بے تکلف اور غیر معنوی عبارت پر مشتمل ہوں لیکن مکتوب نگار کا مقصد ترسیل ضرور ہو۔ لیکن ان تحریروں کے لیے کسی اسلوب کی تخصیص لازمی شرط نہیں۔ اس کا انحصار ہر مکتوب نگار کی ذاتی صلاحیت و طبعی میلان پر منحصر ہے۔ اس لیے ہر رقعہ جہاں مکتوب اور انشاء کے معنی میں داخل ہے، اپنے اسلوب کے لحاظ سے انشاء میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔ رقعہات عالمگیری اس کی بڑی اچھی مثال ہیں۔

مراسلات بھی مکتوبات ہی کی ایک نوع ہیں جو اصطلاحاً سرکاری حکام بالا دست کی طرف سے حکومت وقت کی ایما پر وقتی تقاضوں کے مطابق نظم و نسق سے متعلق امور پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ مراسلات اکثر ری مکتوب نگاری میں آتے ہیں اور اس لیے سرکاری بھی ہو سکتے ہیں و کاروباری بھی جب کہ نجی مکتوب نگاری میں عزیزوں اور دوستوں سے خطاب ہوتا ہے۔ عربی میں یہ تحریریں 'اخوانیات' کہلاتی ہیں۔ ترسیل بہر حال ان تمام مراسلات و مکتوبات کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔

عربوں کے تصور کے مطابق ایجاد تحریر کی بنیادی غایت علم و معلومات سے بڑھ کر محض پیغام رسانی و معاملات ضروری کا ابلاغ تھی۔ یہ حقیقت اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ عربی میں تحریر یا رسم تحریر ہی کو خط کہتے ہیں اگرچہ بعد میں ابلاغ کی مختلف صورتوں کے لیے مختلف نام تجویز ہو گئے۔ البتہ اسلامی تہذیب نے اپنے دور میں مکاتیب و مراسلات کو اس درجہ اہمیت دی کہ قدیم زمانے میں ادب و انشاء کی تکمیل کی بنیاد ہی اچھی خطوط نویسی قرار پائی۔ چنانچہ جو شخص اس زبان و بیان سے کامل شناسائی رکھتا تھا جس کا تعلق دوسروں کے دل و دماغ سے ہے اور جو ان آداب و رسوم سے واقف ہوتا تھا جن کا تعلق روابط و تعلقات کی گونا گوں نوعیتوں سے ہے اس کو اسلامی ادوار میں اکتسابات و فضائل

کے لحاظ سے شاید ترین آدمی سمجھا جاتا تھا اور اس لیے وہ سلطنت کے بڑے بڑے مہدوں کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ ابلاغ کے ذرائع پر قدرت کی اہمیت و فضیلت کا یہ اعتراف اسلامی عربی تہذیب کی روح شناسی کی اہم کلید ہے۔

ادب اسلامی میں مکتوبات تو حضور اکرمؐ کے زمانے ہی میں شروع ہو گئے تھے۔ آنحضرتؐ کے بعد خلفاء اور امرا کے خطوط کا سلسلہ جاری رہا اور پھر جب عہد الملک کے زمانے میں دیوانوں (دقائر) کی زبان عربی ہو گئی اور ساری خط و کتابت عربی میں ہونے لگی تو دیوان کے شعبے رسائل کا نام ہی دیوان اٹھا پڑ گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ عربوں کے ہاں آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کا کاتب عبدالحمید پہلا شخص تھا جو اس فن میں شہرہ آفاق ہوا۔ عربی میں سرکاری اٹھا نگاری میں جن اشخاص کو شہرت حاصل ہوئی ان میں عبدالحمید کے علاوہ الحسن بن سہل، ابواسحاق الصابی، ابن العسیر، صاحب ابن عباد، القاضی، الفاضل الصبا الاصطہانی اور ضیاء الدین ابن اثیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

طرز تحریر کے لحاظ سے نثر کی اقسام:

مرزا قلیل نے اپنی کتاب چار شریعت (ص ۵۹) میں نثر کی تین اقسام یعنی نثر عاری، نثر سنج اور نثر مرتجہ گنا کر ان کی مثالیں بھی دی ہیں۔ پھر اس کے بعد وضائف، شرف الدین علی یزدی، خوبہ محمد گیلانی، ابوالفضل، ظہوری، ترشیزی، مرزا عبدالقادر بیگلر، طاہر وحید اشرف، مرزا مہدی اور غشی صاحب عالم کی طرز تحریر کو پیش کر کے بالتفصیل ان کی خصوصیات بتائی ہیں۔ مرزا غالب بھی نثر کی تین اقسام ہی مانتے ہیں۔ چنانچہ چودھری عبدالغفور کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ”بندے کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم کا ہے۔ منطقی قافیہ ہے وزن نہیں ہے، مرتجہ وزن ہے قافیہ نہیں۔ عاری نہ وزن ہے نہ قافیہ ہے۔“

عالم کا دستور العمل مکتوب نگاری کب کہاں اور کن حالات میں تحریر ہوا؟
 ۱۸۴۵ء میں جب انگریز معمول کے مطابق کسی نا فرمان ہندوستانی ریاست کے خلاف اقدام کر رہے تھے اور عالم اپنے سالے علی بخش خاں کے ساتھ اس مہم میں شریک احمد بخش خاں کے ہر کام میں تھے جنرل کامبر میر کے لشکر نے بھرت پور کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت ہمارے یہ دو بچے رئیس زادے میدان جنگ سے دور خدم و حشم کے لیے ایستادہ عیموں میں بادہ نوشی سے دل بہلا رہے تھے۔ جب فرصت سے طبیعت اوب جاتی تو علی بخش خاں مرزا سے درخواست کرتے کہ وہ قاری اٹھا میں مہارت حاصل کرنے میں ان کی مدد کریں۔ مخاطب کا صحیح طریقہ القاب کا درست استعمال غلطی کی عبادت کو اشعار کے بر محل حوالوں سے دلکش بنانے کے گر اور خط و کتابت کے رموز ان کو سکھائیں۔ مرزا برضا و رغبت یہ کام انجام دیتے۔۔۔۔۔“

اب علی بخش خاں اس دستور العمل کے وجود میں آنے کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں: ”بعد تقدیم نیایش داور جہاں آفریں۔۔۔ ہمیں برادر قدوسی اثر جناب اسد اللہ خاں متخلص پہ عالم کہ در نظم و نثر یگانہ و در سختوری مشہور زمانہ است از سر کبیر نوازی سرے پہ آموزگارئی من داشت۔۔۔ لاجرم مرا با انواع لطف و کرمیت نواختے و ہموارہ بدانش و انیش رہنمائی کردے تا اینکه حسب الاتماس من در حقے چند از آداب و القاب و حکم رسید غلط و خلط و عدم ری مکاتبات رقم فرمود و بمن عطا نمود۔ آن اوراق را چوں تعویذ پیاز و بسم و آن لکشتہ حار و در فن تحریر دستور العمل خود ساختم۔۔۔“

عالم کے دستور العمل مکتوب نگاری کے اوامر و نواہی

عالم نے ان اوامر کو اس طرح بیان کیا ہے۔

۱۔ ”مکتوب الیہ را با قلعے کہ فراخور حالت اوست در سر آغاز صلیح آواز دہم و زحرہ رنج مدعا کردم۔۔۔“

۲۔ ”(مراقبہ) فوشتن را ریکب گفتن و بد و مطلب را بد اس روش بگذارد که در یافتن آن دشوار نہ بودہ اگر مطلبی چند داشتہ باشد در تقدیم و تاخیر از حرف نمی بکارید۔“

۳۔ ”در ہر لور و رعایت درجہ مکتوب الیہ در نظر دارد۔“

۴۔ ”یشتر بہ مذاق اہل روزگار حرف زند۔“

۵۔ ”خطوبی تر ہاں نگاہ دارد۔“

۶۔ ”بچہ ستہ در آن کوشد کہ سادگی و غفزی شعار او بود۔“

۷۔ ”تا توان سخن را در آزی نہ دہد و از تکرار الفاظ سترز پاشد۔“

غالب نے مندرجہ بالا ہر امر کے ساتھ اس کی فہمی کو مصلحتات میں شامل کیا ہے۔ ایک طریقے سے یہ اس ہی امر کی تشریح کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً اصول اوامر میں ہے کہ ایسے ایک لفظ سے کہ مکتوب الیہ کے حسب حال ہے خطاب کیا جائے اور مدعا نگاری شروع کر دی جائے۔ یعنی اس ضمن میں یہ ہے کہ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی سے کہ حشو و زوائد میں آتے ہیں احتراز کیا جائے۔ دوسرے اوامر کے لواحق بھی اسی طرح قیاس کیے جاسکتے ہیں۔

غالب نے اپنے دستور العمل کی خود کس حد تک پیروی کی؟

یہاں تک پہنچنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ غالب نے خود اس دستور مکتوب نویسی کو اپنے مکاتیب میں کہاں تک ملحوظ خاطر رکھا اور واضح کردہ اصولوں کی خود کس حد تک پیروی کی۔ اب چون کہ اس دستور العمل کی تکمیل اور عملی بخش خاں کو اس کی تحویل کے فوراً بعد ہی غالب نے سفر کلکتہ اختیار کیا تو اس مقصد کے لیے وہی خطوط جو اس سفر کے دوران اور قیام کلکتہ میں لکھے گئے انتہائی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ سارے خطوط بعنوان ۱۹ ”نامہائے فارسی غالب“ مرتبہ علی اکبر ترمذی و مطبوعہ غالب اکیڈمی دہلی کتاب کی شکل میں دستیاب بھی ہیں۔

مذکورہ بالا تالیف مکتوبات میں کل اکتیس خطوط ہیں۔ جس میں چوبیس خطوط باندے

کے مولوی محمد علی خاں کے نام ہیں جو غالب کے دوست، بہرہ کرم فرما سب ہی کچھ تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم دستور العمل کی دوسری شقوں کی طرف متوجہ ہوں سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے پہلے واشکاف اعلان کی "چوں کلف و ورق پہ کتب کیرم مکتوب الیہ رابطہ قلمیہ کے فراخوردہ دست در سر آغا صفی آواز و ہم و زمزمہ سچ مدعا گردم" کہاں تک بھڑکی کی ہے۔ چنانچہ ان خطوط کے القابات کے جائزے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے چوبیس میں سے صرف پانچ میں اپنے دستور کی بھڑکی کی ہے جب کہ پندرہ میں صریح خلاف ورزی کی ہے کہ یہ خطوط "فرما زوائے کشور آگہی" ملاذ و مطامع رہی سلامت" جیسے القابات سے مزین ہیں۔ خطوط کے کرم خوردہ ہونے کے سبب تین خطوط کے القابات خطوط میں لکھے نہیں جاسکے۔ سو یہ تو بات ہوئی صرف القابات کی۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ زمزمہ سچ مدعا کس طرح ہوتے ہیں۔

مثالوں کی شمولیت چوں کہ طوالت کا باعث ہے اس لیے ان سے صرف نظر کرتے ہوئے اس بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ ان خطوط میں اکثر و بیشتر غالب نے اپنے دستور العمل کی خلاف ورزی بڑے دھڑلے سے کی ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ تحریریں تقریر سے کوئی قربت نہیں رکھتیں اکثر اس تحریر سے بھی بعید ہیں جن کا مقصد مدعا نگاری ہوتا ہے اور اگر ان دو خطوط کو بھی جو صنعت تعطیل میں لکھے گئے ہیں نظر میں رکھا جائے تو کہنا چڑتا ہے کہ غالب نے خود وہی کیا ہے جس سے وہ بظاہر نفرت کا اعلان کرتے تھے کہ یہ دونوں خطوط صریحاً بانقض سوائے خود نمائی کے اور کسی زمرے میں نہیں آتے۔ بلکہ ان خطوط کی نقل کو (یہ دو خطوط مولوی محمد فضل حق صاحب اور لکھنؤ کے وزیر معتمد الدولہ کے نام تھے) محمد علی خاں کے خط میں ارسال کرنا تو خود نمائی کا بھی تیسرا درجہ نظر آتا ہے۔

اب اگر نثر فارسی کے باب میں غالب کی انتہائی اہم تالیف "سچ آہنگ" دیکھی جائے تو وہاں بھی صورت حال کچھ مختلف نظر نہیں آتی۔ "سچ آہنگ" کے آہنگ پنجم میں ۱۶۹ خطوط ہیں جو اے مکتوب الہم کو لکھے گئے ہیں۔ یہ خطوط ایک عام انداز سے لکھے گئے ہیں۔ ۳۵ سال کے عرصے کو محیط ہیں۔ مکتوب الہم میں ان کے شاگرد دوست بے تکلف

یارانِ بزمِ امرا دورِ انوارِ عقیدت مند و بیدار صاحبانِ قلم اہلِ کلام وقت سب شاہس
ہیں۔ لیکن ان ۱۶۹ خطوط میں بھی کسی جگہ غالب نے بھول کر بھی اپنے بتائے ہوئے
دستورِ اہل کی پیروی نہیں کی ہے۔

یہاں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے! ابھی ان کے دستورِ اہل کی
سیاسی بھی تنگ نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی (یہ خاص
حوالہ سفر و قیام نکلتے کے دوران لکھے گئے خطوط کا ہے)۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غالب
نے اپنے دستورِ اہل میں اس مکتوب نگاری کے اصول بتائے ہیں جو مدعا نگاری پر حصر
ہو۔ یہ دستورِ اہل ان مکاتیب کے لیے نہیں جو اشعار نگاری کے ذمے سے آتے ہوں
اور جن کا مقصد تفسیر، طبع، تخلیق ادب اور سب سے بڑھ کر ”نمایا عن قدرتِ نویندگی“ ہو۔
اس طویل تحریر کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب کے دستورِ اہل مکتوب نگاری کا ان کے
اکثر قاری خطوط پر اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ اور اس موضوع پر ڈاکٹر شیخ محمد اکرام راقم مقالہ
سے متعلق نظر آتے ہیں۔

۵ ”غالب نے مرزا علی بخش کی استدعا پر جو فارسی رسالہ ۱۸۴۵ء میں مکتوب نویسی
کے متعلق لکھا تھا اس سے خیال ہوتا ہے کہ خط و کتابت کے متعلق ان کا شروع سے ایک
خاص نقطہ نظر تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مکتوب نویسی میں وہی زبان استعمال ہو جو گفت و
شنید میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے فارسی خطوط میں اس نقطہ نظر کی
پیروی نہیں کی اور مکتوب نویسی میں وہی پر تکلف اور ممنوعی طرز اختیار کیا جو ان کے
زمانے میں مروج تھا اور جس پر ان سے پہلے مشہور اشعار پرداز کا فرما تھا۔ چنانچہ وہ قلیل
کی سلیس فارسی نثر پر تکیہ چینی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں ”تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر
تقریرِ اہم تحریر میں آیا کرے تو خواجہ بگرام اور شرف الدین یزدی اور ملا حسین کاشفی اور
ظاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں، خونِ جگر کھایا کرتے اور وہ سب طرح کی نثریں جلالہ
دیوان سنگھ قلیل متونی نے ہلکیہ اہلِ ایران لکھی ہوں نہ دم فرمایا کرتے۔“

”مرزا نے نثر نویسی کے متعلق قلیل کا نقطہ نظر جو اصولاً صحیح تھا قبول نہ کیا لیکن جب

وہ ۱۸۵۰ء میں تاریخ نویسی پر مامور ہوئے اور ان کے پاس اس قدر وقت نہ رہا جو فارسی مکتیب... کے لیے کافی ہو اور ساتھ ہی بڑھاپے کے سبب جب وہ اس کاوش اور دماغ سوزی کے لائق نہ رہے تب انھوں نے اردو میں مراسلت شروع کی اور زبان میں بے تکلف طرز تحریر استعمال کیا...

مرزا نے اردو میں سادہ اور بے تکلف طرز تحریر کسی ادبی اصول کے تحت نہیں بلکہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے شروع کیا تھا... لیکن جب یہ طرز تحریر کامیاب ہو گیا اور ان کی طبع خدا داد نے اس میں ایسی رنگینیاں پیدا کر دیں کہ خاص و عام کو پسند آیا تو وہ اس پر فخر کرنے لگے اور اسے خاص اپنی ایجاد قرار دیا۔

۱۔ مولانا غلام رسول مہر بھی اس موضوع پر مضمون نگار سے متعلق ہیں اور غلطوب غالب کے دیباچے میں فرماتے ہیں: "مرزا غالب نے اپنے (اردو) غلطوب میں سادہ اور سلیس انداز اختیار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں اردو مکتبہ شروع کی جب فارسی میں ان کی معافی اوج کمال کو پہنچ چکی تھی... یہ حقیقت ان پر کھل چکی تھی کہ عہادت میں قدم قدم پر بیچ ڈالنا، نئی نئی ترکیبوں سے بوجھل بنانا، علم و فضل کی فرائض کا صحیح طریقہ نہیں۔ بلکہ نقص مطلب ایسے رنگ میں پیش کرنا چاہیے کہ مخاطب بے تکلف اسے بخوبی سمجھ جائے۔"

اس مرحلے پر ایک انتہائی دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے جو بردیدہ ور اور صاحب علم کی توجہ چاہتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ مکتبہ نگاری کے محاسن جانتے ہوئے اور اس دستور العمل کا پرچار کرتے ہوئے جس پر ان کے اردو مکتبہ نگاری کی ساری عمارت سرکشیدہ کھڑی ہے، وہ فارسی غلطوب میں ان اصولوں کی پیروی نہ کر سکے بلکہ کہنا چاہیے کہ واضح اور اعلانیہ خلاف ورزی کرتے رہے۔

اس اہم سوال کا جواب، لیکن وہ بھی صرف ایک حد تک جناب مالک رام نے "ذکر غالب" میں دیا ہے۔ چنانچہ غالب کے نئے اسلوب نگارش مکتبہ کے بارے میں جو اردو سے وابستہ ہے اور اردو ادبیات میں وجہ امتیاز و افتخار ہے بڑی وضاحت سے

کہتے ہیں۔ "یعنی" اس ضروری اصلاح کو فارسی میں رائج کرنا بہت مشکل تھا کیوں کہ ان کے مخاطب بیشتر پرانی طرز کے بزرگ اور روایت کے فقیر روایت پرست حضرات تھے۔ یہ لوگ صدیوں سے ایک خاص پر تکلف طرزِ مکاتیب کی تقلید کرتے آ رہے تھے۔ انہیں کسی اصلاح کے قبول کرنے یا خود اس پر عمل کر لینے پر آمادہ کر لینا محال تھا۔ اس کے مقابلے میں چوں کہ انھوں نے اردو نویسی بہت بعد میں شروع کی اور یہاں ان کے مخاطب عام طور پر نوجوان طبقے کے لوگ یا مزید شاگرد تھے اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ اس تبدیلی پر جربزد نہ ہوئے بلکہ کسی حد تک خود ان کے معاون بن گئے اور فرمائش کر کے ان سے یہ خطوط لکھواتے رہے۔" میرے خیال میں ازل تو یہ بات کہ ان کے اردو اسلوب نگارش کے پرستار صرف یا اکثر نوجوان طبقے کے لوگ تھے کل نظر ہے گویا ان کے فارسی اسلوب کے شائقین اکثر بوڑھے عمر رسیدہ بزرگوں میں سے تھے! ممکن ہے یہ دعویٰ چنداں درست نہ ہو لیکن اس قدر حقیقت ضرور ہے کہ یہ مندرجہ بالا اقتباس سوال کا پورا جواب نہیں۔ البتہ ادھورا جواب ضرور ہو سکتا ہے۔ اس معنی میں کہ اظہارِ بیان کے، یہ پر تکلف، آرائشی اور مصنوعی سانچے اس قدر مضبوط، منضبط اور مسلم تھے کہ ان سے اس دور کے کسی صاحبِ علم کی روگردانی ممکن نہ تھی۔ لیکن غالب کے لیے اردو کے اس اسلوب کو فارسی میں رائج کرنا ایک اور سبب سے بھی ممکن نہ تھا اور قادرِ مبینِ مکرّم وہ سبب یہ تھا کہ فارسی ان کی مادری نہیں اکتسابی زبان تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو کے معیار کے خطوط فارسی میں اپنی تمام قدرت، بیان کے باوجود لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ بے شک مبداءِ فیاض نے فارسی آموزی میں بھی غالب کے لیے پوری فیاضی سے کام لیا تھا اور ان پر اپنے سارے خزانے کھول دیے تھے لیکن اکتسابی مہارت جو ہڈیوں یا عقلوں سے حاصل ہو شیرِ مادر کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس فرق کو وہ بڑے واضح طور پر اپنے خطوط میں بار بار مختلف الفاظ میں بیان کرتے رہے ہیں۔ مثلاً عبدالرزاق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "بندہ نواز فارسی میں خطوط لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ بیرادہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت چڑھی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت کو ڈال ہے۔"

یا سوانح محمد عباس بھوپال کو لکھتے ہیں "از دیر باز محققین بشر بہ پارسی زبان آئین من نیست۔ نامہ سائیکدست بہ اردو چھپتی خود... یارب ایسے فرمان چوں بجائی آدم دور نامہ چہ تو سنم۔"

مصدقہ بالا حقایق سے ثابت ہوتا ہے کہ مکاتیب نگاری کے صحیح اصولوں سے واقف ہونے اور ان اصولوں کی صیانت پر یقین رکھنے اور ان کے پرچار کرنے کے باوجود وہ اصول ان کے خون میں رچے بسے نہیں تھے۔ اور وہ اس وجہ سے کہ فارسی ان کی اکتسابی زبان تھی۔ اس کی ہر تحریر "محنت پڑوسی اور جگر کاوی کی قوت" کی طلب کا رخصی۔ اردو خطوط کی طرح ان کو قلم برداشتہ نہیں لکھا جاسکتا تھا اور نہ ہی وہ خطوط اردو خطوط کے اس لہجے اس آہنگ اس جاذبیت کے مرتبے کو پہنچ سکتے تھے۔

دستور العمل مکتوب نگاری کے داخلی و خارجی متنازع

اس ضمن میں بنیادی حیثیت تو ان کی فطری جدت پسندی اور انفرادیت کو حاصل ہے۔ یہ اس دستور العمل کا داخلی منبع تھا۔ یہ وہ فطری رجحان تھا جو وہ لے کر پیدا ہوئے اور جو انہیں زندگی کے ہر شعبے میں تقلید سے روکتا اور منفرد روش اختیار کرنے پر مجبور کرتا۔ وہ اس وقت پایا بخ لوز جتے جب کوئی نہیں لوز جتا تھا۔ وہ لنگی جو وہ سر پر باندھتے تھے عام دلی دالوں سے یکسر مختلف ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے چہرے کی صورت میں بھی ہمیشہ امتیاز رکھا۔ جب داڑھی رکھی تو سرمندہ لولیا۔ لیکن اس باطنی رجحان کو ہمیز کرنے کے لیے انھیں خارج میں بھی ایسے عوامل ملے جس سے ان کی جدت پسندی راسخ ہوتی گئی اور پلا آخر مکتوب نگاری میں بھی عام روش سے ہٹ کر وہ اس دستور العمل تک پہنچے جس کو انھوں نے آہنگ اول میں علی بخش خاں کے لیے منضبط کیا۔

عالم کے اس باطنی رجحان کو شدید ہمیز اس ماحول سے ملا، جو انگریزوں کے نظام تعلیم کے سبب ہندوستان میں پیدا ہو گیا تھا۔ "ای" ہندوستان میں انگریزوں نے ابتدا ہی سے تعلیمی اداروں کے قیام پر خاص توجہ دی تھی جس کی وجہ تحریک ان کی یہ خواہش تھی

کہ نوا با ویاتی استحکام کے لیے انگریز افسروں کے لیے دیسی زبانوں اور تہذیب سے واقفیت کا موقع فراہم کیا جائے اور اس طرح ان کے رواداروں کو تہذیبی نقطہ نظر سے حکومت بنانے میں مدد ملے گی۔ چنانچہ دارن ہسٹنگز نے ۸۱ء کلکتے میں مشہور مدرسہ عالیہ قائم کیا سرڈکن نے ۹۱ء میں بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کی بنیاد رکھی اور ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی تاسیس کی۔ ۱۸۰۳ء تک فورٹ ولیم کالج کے جان گلکراسٹ انگریزی کی منتخب کہانیوں کا ہندوستانی، فارسی، عربی، ہرج بھاشا، بنگالی اور سنسکرت میں ترجمہ کراچکے تھے۔ آگرہ کالج ۱۸۲۳ء میں قائم کیا گیا اور بعد میں بمبئی، بنگال اور مدراس تینوں پریزیڈنسی صوبوں میں یونیورسٹیوں کی ابتدا ہوئی۔ اور دہلی میں مدرسہ غازی الدین میں ۹۲ء سے بروئے کار اسکول کی عظیم جدید برطانوی مجلس تعلیم عامہ کی طرف سے فراہم کردہ مالی وسائل سے عمل میں آئی۔“

”۱۸۲۳ء سے ۱۸۵۷ء تک دہلی کالج سی ایف ایچ ریزر کے الفاظ میں دانش جدید کو رواج دینے کا مرکز بن گیا جو تاگزیر طور پر واضح ترین مرکز تہذیبی لسانی تھا۔ انگریزی زبان و ادب کی جماعتیں ۱۸۲۷ء میں شروع کی گئیں... کالج میں اردو، عربی اور فارسی ادب کے لیے ایک علاحدہ اور عقل یعنی مشرقی شعبہ بھی تھا... جو انتہائی مقبول ہو گیا... جدید انگریزی علوم کی تحصیل کے لیے طلبہ ان جماعتوں کو جہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا چھوڑتے نہیں تھے... فارسی اور عربی میں طلبہ کی جس معیار تک رسائی تھی وہ بہت بلند تھا۔ ممتاز مشاہیر الطاف حسین حالی اردو کے مسلم الثبوت نثر نگار نذیر احمد عربی کے ممتاز فاضل مولوی ضیاء الدین اور آب حیات کے مصنف محمد حسین آزاد کا تعلق اسی مشرقی شعبے سے تھا۔“

”... زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اردو کی بے مثل مقبولیت پر متح ہونے والی لڑکی سرگرمیوں کی حقیقی نشاۃ ثانیہ کا آغاز دہلی کالج کے قیام سے پہلے ہو چکا تھا... کالج نے لوگوں کی قوت عقیدہ کو گرفت میں لیا تو ان درجوں کی بدولت جو اس نے مغرب میں علوم طبعیات کی تحصیل میں پیش رفت کے لیے ہار کیے تھے، علوم طبعیات پر انگریزی کتابوں

کا بڑی جفاکشی اور جوش و خروش سے اردو میں ترجمہ کیا جاتا اور تعلیمی تقسیم کی جائیں۔ کالج کے ایک اور ممتاز فارغ التحصیل سرسید احمد خاں تھے جنہیں ریاضی اور علم آثار قدیمہ میں یکساں درک تھا۔ اور جنہوں نے بعد میں ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ میں مسلم ایٹھکو اور رینٹل کالج کا علم کیا۔“

اب میں آپ کی خدمت میں فاضل مرتب مرتضیٰ حسین فاضل کے کئے ہوئے ”عود ہندی“ کے دیباچے سے کچھ اقتباس پیش کرتا ہوں جو ذریعہ نظر بحث میں اچھائی مناسب اور برکت نظر آتا ہے۔

”ایٹھ اطریا کہنی نے تعلیمی نصاب مرتب کیے تو فارسی خطوط و رقعات کے ساتھ اردو خطوط کے نمونے بھی درسی کتابوں میں داخل کیے گئے۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس قسم کی ایک کتاب موجود ہے جس کا نام ”فارسی اور اردو کی الفا“ ہے۔ اس کتاب پر فورٹ ولیم کالج کی سرنگی ہوئی ہے۔ مرتب نے جس کا نام Capt. T.H.G. Besant ہے فنی نعت خاں اکبر آبادی کی مدد سے مرتب کر کے یہ کتاب اس وقت کے گورنر کو پیش کی تھی۔ اس میں مختلف قسم کے رقعات و عرایض کے نمونے دیے گئے ہیں، اس طرح کہ ہر فارسی خط کے سامنے اس کا اردو ترجمہ موجود ہے۔ یہ کتاب نسخ میں ہے اور ۱۹۱۱ء صفحات پر مشتمل ہے۔“

خطوط کے پڑھنے پڑھانے کے دو مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ طالب علم فارغ التحصیل ہونے کے بعد سرکاری اور سیاسی مراسلت کے اسالیب سے پوری طرح واقف ہو جائے دوسرے یہ کہ اسالیب بیان کے ساتھ ادب کے اعلیٰ مسائل معنی و بیان کی تعلیم پاکر ان کے استعمال کا طریقہ سمجھ لے۔ ہزار سالہ مشکل پسندی کا دور ختم ہونا ہی تھا۔ چنانچہ سلاست کا دور آنا ایک طبعی عمل ہے۔ اتفاق سے اس کے کئی عوامل بھی پیدا ہو گئے جنہی عکرائوں کے لیے عربی، فارسی اور اردو کا بیک وقت سمجھنا مشکل تھا۔ فن خط نویسی کے لیے اسلامی روایات و علوم، عربی ادب اور فارسی کے رموز و نکات سے واقف ہونا ضروری تھا جو انگریزوں کے لیے ناممکن بات تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک نئی تہذیب کو بھی

جنم دینا چاہتے تھے... چنانچہ انھوں نے اپنا نیا نصاب تیار کرنے والوں کو الف لیلہ، مقامات حریری، تاریخ و صاف... کے اسالیب کے برعکس سادہ زبان لکھنے کا پابند کیا...

... انھوں پر دلائی یعنی خطوط نگاری کے لیے بھی سادہ تحریریں مطلوب تھیں۔ چنانچہ اس طرح کی جو کتابیں لکھوائی گئیں ان میں سے دو ایک میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ یہ کتابیں ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھی گئی تھیں اور مخصوص تعلیمی حلقے کے نصاب میں شامل تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد چوں کہ انگریزوں نے دلائی دور دور تک پھیل گئی اس لیے مطبوعات اور موبنین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں میں نے جو کتاب ابتدائی جماعتوں میں پڑھی تھی اس کا نام ”مکتوب احمدی“ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کتاب ۱۸۶۰ء کے قریب مرتب کی گئی ہوگی۔ اس وقت میرے سامنے ایک ایسی نصابی کتاب ”انھا اردو“ ہے جو خطوط، واقعات و رسیدات پر مشتمل ہے اور جس کا خط ”مکتوب احمدی“ کی طرح شکستہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۳ء میں ترتیب دی گئی تھی... اٹلانا یہ مقصود ہے کہ غالب کے عہد میں فنی اور نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ کتابیں رائج ہو چکی تھیں۔“

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام تعلیم نے سارے ہندوستان میں نئے نظریات و طیالات کے ذریعے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس میں دلی کو مغلیہ سلطنت کا پایہ تخت ہونے کے سبب اور دلی کا لالچ کی زبردست کامیابی کے طفیل ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ غالب قطر تاجدت پسند اور منقرو مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی بیدار مغز اور ذکی افس انسان تھے۔ اس لیے انھوں نے ان تمام تبدیلیوں کو اپنے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں بہت جلد محسوس کر لیا اور فکری طور پر مکتوب نویسی میں سادہ اور سلیس زبان کے ساتھ مذہب نگاری کے اصول کو تسلیم کر لیا اور زندہ و پایندہ رہنے کے عام قانون کو اپنی شاعری کی طرح اپنی نثر پر بھی نافذ کر لیا۔ لیکن یہاں جو خاص بات لائق توجہ ہے وہ یہ کہ ۱۸۲۵ء میں علی بخش خاں کے لیے آہنگ اڈل میں دستور العمل نامہ نگاری لکھ کر وہ اس طرز و اسلوب کے ہائی نہیں بن سکے۔ البتہ ان کو اس نئے اسلوب کو مستحضر اور مروج کرنے کی سیادت حاصل ہے۔ اور یہ اس لیے کہ کمپنی کے اپنے

امردوئی انتظامی مقاصد کے پیش نظر خصوصاً اور جدید نظام تعلیم کے مقاصد کی تکمیل کے لیے عموماً مکتوب نگاری کا وہ آئین جو غالب نے آجنگ اڈل میں تحریر کیا ہے بہت عرصہ پہلے عمل میں آچکا تھا اور سید مدرسوں اور کالجوں میں اس کے اصول بتائے اور پڑھائے جا رہے تھے۔ اور مثلاً صبح و شام کے خلاف سادہ و سلیس نگاری فورٹ ولیم کی کتابوں کے علاوہ بھی نظر آ رہی تھی۔ مثلاً پائل کا وہ ترجمہ جو بہرام پور میں چچا، شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ رفیع الدین محدث کے تراجم قرآن مجید اور شاہ اسماعیل شہید کی تقویت الایمان جو ۱۸۱۸ اور ۱۸۲۰ کے درمیان لکھی گئی۔ پھر سید احمد شہید بریلوی کے مریدوں اور معتقدوں نے عربی کی بعض مذہبی کتابوں کے سلیس اردو میں ترجمہ کیے اور اس طرح شیعوں چھوٹے چھوٹے رسالے عام فہم زبان میں لکھے گئے جن کا مقصد ... یہ تھا کہ اردو پڑھنے والا ہر شخص استاد کی مدد کے بغیر ضروری دینی مسائل سے آگاہ ہو جائے۔ اس طرح سادہ اور عام فہم اسلوب کو خاص تقویت پہنچی۔“

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ مکتوبات کے دمرے میں حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات بھی سلیس و سادہ نگاری اور اس لیے ابلاغ و مدعا نگاری کی بہترین مثال ہیں۔ بلکہ اس مرحلے پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنے وسیع و عظیم مقاصد کے پیش نظر بزرگان دین کے جتنے مکاتیب بھی ہیں وہ مدعا نگاری اور سادہ نویسی کی منہ بولتی تصویر ہیں اور عرصہ دراز سے اپنی قدیم روایت کا حصہ ہیں۔

غالب کی فارسی نثر کے اجزائے ترکیبی

میرے خیال میں غالب کی نثر کے اہم اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ خود نمائی اور قدرت بیان کا مطلق و مطلق۔

۲۔ سرہ نویسی کی کوشش۔

۳۔ دستوری علامات و صحیح نگاری و محاورات۔

ان کی فارسی مکاتیب نگاری بڑی حد تک انھیں نگاری کے دمرے میں آتی ہے جو

ہذا تہ خود صنایع اور بدائع پر منحصر ہے۔ یہ اظہار و بیان کے ایسے چھیدہ اور مشکل طریقے ہیں کہ ان کو کسی تخلیق کے محاسن میں شمار کرنا ہی آج غلابِ عقل اور بے معنی نظر آتا ہے۔ لیکن اُس زمانے کی روش اور رواج نے کسی عقلی قومی و سماجی نصب العین نہ ہونے کے سبب اُن کو تخلیق کے محاسن میں شامل کر رکھا تھا۔ غالب بھی اپنے فارسی خطوط میں ان پر تصنع چھیدہ اور گراں فہم اسالیب کے اتباع میں ”اس رام سخن کے غول“ میں شامل نظر آتے ہیں جس کو وہ بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ نامہائے فارسی غالب مرتبہ اکبر علی ترمذی میں شامل چھ سات صفحات پر مشتمل صرف وہ دو خطوط جو صنعتِ تطیل و صنعتِ مقلع المعروف میں لکھے گئے ہیں اگر نظر میں رکھے جائیں تو غالب کی ترقی پسندی اور بلند خیالی کا پل کھل جاتا ہے اور اگر صرف عہدِ شاہجہاں میں مکتوباتِ سعد اللہ خاں، منہآتِ برہمن (چندر بھان برہمن)، انشائے منیر (منیر لاہوری) اور انشائے ہر کرن (ہر کرن) کو شامل کر کے ہم اٹھارویں اور انیسویں صدی تک آئیں تو فنِ انشاء کی تحقیقات ہزاروں کی تعداد تک پہنچتی ہیں۔ میر (صاحب تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند) نے صرف اٹھارویں اور انیسویں صدی کی اہم ترین تالیفات کی تعداد چالیس کے قریب بتائی ہے) اور ان کے سامنے غالب کے پر تصنع خطوطِ علمی و ادبی دنیا کا کوئی اہم واقعہ معلوم نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب کی فارسی خطوط نگاری ان کے اپنے یا ساہتہ دور کے کسی انشاء نگار کی خود نمائی کی کاوش سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسے اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ غالب اپنے فارسی خطوط میں زور بیان کے اظہار اور قدرتِ کلام کے مظہرے میں عام انشاء نگار کی طرح غلو نمائی کے شکار نظر آتے ہیں۔

سرہ نویسی

غالب کے فارسی خطوط کی نثر کا دوسرا اہم جزو ترکیبی سرہ نویسی ہے یعنی ایسے الفاظ کا استعمال جو خالص فارسی کے ہوں اور ان میں عربی الفاظ کی ملاوٹ نہ ہو۔

ڈاکٹر محمد غلام سرور اپنی تصنیف تاریخ زبان فارسی کے پانچویں باب میں "نہضت سرہ نویسی در شہ قارہ پاکستان و ہند" میں لکھتے ہیں "مادر بچہ تحقیقات خود نامہ ای از امیر خسرو دہلوی بدست آورده ایم کہ او در دو شین رسالہ از رسائل الامجاز خود درج نمودہ است۔ اس نامہ در ۱۲۸۳ء در فارسی خالص نوشیدہ شدہ است۔ و اس امر را ہائات رسانند کہ امیر خسرو دہلوی در ربع چہارم قرن یزدہم میلادی بخاری خالص دل بستگی داشتہ و اثر خوبی از خود پیدا دگار گذاشتہ است۔"

امیر خسرو کے بعد فارسی خالص کا بڑا حامی و بانی شیخ ابوالفضل علی کوٹا جاتا ہے اور ڈاکٹر غلام سرور کے مطابق اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ابوالفضل کے بعد غالب ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے خالص فارسی نویسی پر سنجیدگی سے توجہ دی۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ دراصل اس ضمن میں ہمارے سارے زبان فارسی کے تاریخ دان اس واپسی ادب کو جو بارہویں، تیرہویں صدی عیسوی سے اب تک لکھا جا رہا ہے حساب میں نہیں لاتے۔ یہ ادب ملفوظات و مکتوبات کی شکل ہی میں دستیاب نہیں بلکہ باقاعدہ عام رسالوں اور کتابوں کی شکل میں دینی موضوعات پر تخلیق ہوتا رہا ہے اور چوں کہ اس کا مقصد ہی سلیس زبان میں ابلاغ مفہوم تھا اس لیے اس ادب کی زبان سادہ عام فہم اور سنجھا عربی کے ہماری بحرکم الفاظ سے پاک تھی۔ گویا سرہ نویسی کو ان علمایا ساکان طریقت و شریعت نے کسی تحریک کے طور پر جانا نہ چاہا۔ البتہ مدعا نگاری، کے سبب وہ سلیس و سادہ زبان استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ اس ضمن میں شیخ علی سرہندی کے مکتوبات۔ کہ علاوہ ان کے بیٹے شیخ محمد معصوم کے مکتوبات بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اب اپنے دعوے کے ثبوت میں ڈاکٹر غلام سرور ہی کی مرتبہ کتاب "جواہر الاولیا" کے مقدمے سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں یہ کتاب مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان سے ۱۹۷۶ء میلادی میں شائع ہوئی ہے۔ "۱۶۰ و ۱۶۱ء جای بسیار تعجب است کہ در حدود یک قرن و نیم بعد از ابوالفضل علی، سید باقرین عثمان بخاری در یک قریب دور دست (اچھ شریف) ... در جواہر دوم اس کتاب "جواہر الاولیا" در بیان نام ہائے باری تعالیٰ لغات و ترکیبات و جملات فارسی سرہ را

تجدیدی زیادہ استعمال کردہ است۔۔۔۔۔“

یہ نیچے دعویٰ کرنے والے ہی نے خود اپنے بیان کی تردید کر دی۔ حقیقت میں ہم اپنی لاعلمی کے باعث یہ تصور کرتے ہیں کہ ابوالفضل علامی کے بعد غالب ہی فارسی سرہ نویسی میں سربراہ و درودہ شخصیت ہے جب کہ عرفانی ادب میں تو زبان فارسی میں جو کچھ بھی چھپا ہے اس میں سے اکثر فارسی سرہ ہی ہے۔ غالب سے پہلے بھی نیکزادوں اور اس کے بعد بھی نیکزادوں ایسے اٹھانکار ہوں گے جنہوں نے فارسی سرہ میں لکھ کر اسی قدر ت زبان کی نمائش کی ہوگی۔

اتفاق سے میرے سامنے اس وقت ایک انشا کی کتاب ہے، جس کا نام ہے ”انشائی بہارِ بزم“ ہے۔ یہ بیس صفحات پر مشتمل ہے، ۱۳۹۸ھ میں مطبع انوار محمدی میں محمد تنج بہادر کے نام سے چھپی ہے، ۱۳۱۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ایک غیر معروف شخص سید امانت علی ساکن روٹا ہی معروف ہے پورانی از مضامین فیض آباد کی تصنیف ہے اور فارسی سرہ میں لکھو سے کانپور تک کے کشتی کے سفر میں قلم برداشت لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے چند دوسرے دلدوز حقائق یہ ہیں کہ انشائی بہارِ بزم کا مسودہ ۱۲۶۹ھ میں مکمل ہو چکا تھا جب غالب صرف چودہ برس کے تھے (غالب کی پیدائش ۸ ربیع ۱۲۱۲ھ)۔ دوسری دلدوز حقیقت اس کتاب سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس کتاب کی تحریر اور طباعت میں پورے بہتر (۷۲) سال کا فاصلہ ہے۔ (تحریر ۱۲۲۶ھ طباعت ۱۳۹۸ھ)۔ عیسوی سال کے حساب سے دہخند (جو غالب کے دعوے کے مطابق فارسی سرہ میں لکھی گئی ہے) یکم اگست ۱۸۵۸ء کو مکمل ہوئی اور نومبر ۱۸۵۸ء کو طبع پذیر ہوئی جب کہ ”انشائی بہارِ بزم“ ۱۸۱۱ء میں مکمل ہوئی اور ۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی۔ سو فارسی معظّم میں نہیں سمجھتا کہ غالب نے اپنے فارسی خطوط اور دوسری نثر میں سرہ نویسی کر کے کوئی ایسا معرکہ مارا ہو جو اس دور کے علمی و ادبی ماحول میں مجھ کی رکھتا ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غالب نے سرہ نویسی کی کوشش میں فارسی ادب میں نئے الفاظ، نئی تراکیب اور نئے استعاروں کا خاصہ اضافہ کر دیا ہے۔ اور بقول ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ۱۵

”ان کی بدولت فارسی زبان کا دامن مالا مال ہو گیا ہے۔“

آپ نے اب ان اجزائے ترکیبی کے آخری نکتے کج نویسی، دستورى علامات و محاورات پر۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عزیز احمد اپنے مقالے ”غالب کی فارسی نثر نگاری“ میں متعدد ذیل نکات تحریر فرماتے ہیں۔

- ۱- ان کی عبارت کی کوئی ایسی سطر نہیں جس میں کج نہ ہو۔ یہ ان کے خطوط کی بڑی خصوصیت ہے اور مسئلہ طور پر عبارت کی دل کشی میں اضافہ کرتی ہے۔
 - ۲- ان کی فارسی نثر کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے برخلاف متداول و مروجہ اشکال افعال کے قدیم اشکال افعال استعمال کیں۔
 - ۳- وہ ماضی تہائی کا استعمال فعل استمراری کی بجائے جو آج کل مروج ہے قدیم طریقے سے کرتے ہیں۔
 - ۴- صنعت مقلوب کا استعمال۔
 - ۵- تک اضافت کر کے مضاف الیہ مقدم کرتے ہیں اور اُردو کا اضافہ کر دیتے ہیں۔
 - ۶- فارسی ادیبوں کی عہدوی میں صفت مُرَقَّم کے دونوں اجزاء کے درمیان فقرات شامل کر لیتے ہیں۔
 - ۷- دساتیر کی عہدوی میں صفات مرکبہ کو کافی استعمال کیا ہے۔
 - ۸- عربی زبان میں صفت موصوف کی تطبیق ضروری امر ہے۔ فارسی میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں۔ لیکن غالب جو فارسی نفوذ کے اس قدر حامی تھے عربی اصول کی پابندی کرتے نظر آتے ہیں۔
 - ۹- محاورات کے استعمال میں بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔
- اب اگر اپنے مہم کے ایک دوسرے نکتہ رس صاحب علم و فضل جناب ڈاکٹر عبدلیب شادانی پر نظر ڈالی جائے تو وہ ”مرزا غالب کا اسلوب نگارش“ میں متعدد ذیل نکات لایق توجہ سمجھتے ہیں:
- ۱- مروجہ عربی الفاظ کے بجائے فارسی الفاظ کا استعمال۔
 - ۲- فارسی کے مانوس و مروجہ الفاظ کے بجائے مانوس و غیر معروف الفاظ کا استعمال۔

- ۳- اضافتِ مقلوب کا استعمال۔
- ۴- فرد فرد کا بکثرت استعمال۔
- ۵- گمراہیوں کے مشتقات کا بکثرت استعمال۔
- ۶- لفظ 'والا' کا بکثرت استعمال۔
- ۷- گمراہیوں کے مشتقات کا بکثرت استعمال۔
- ۸- گمراہیوں کے مشتقات کا بکثرت استعمال۔
- ۹- شہیدوں کے مقابلے میں شہنشاہوں اور حکیموں کے مقابلے میں بخشنوں اور خوشنوں کے مقابلے میں بخشن کا استعمال۔
- ۱۰- کہیں کہیں قافیے کا استعمال۔
- ۱۱- کہیں کہیں صنعتِ عکس کا استعمال۔

مندرجہ بالا نکات کو غالب کی نثر کا سامانِ تعمیر گردانتے ہوئے ڈاکٹر عبدلیب نے بیچ آہنگ اور آئین اکبری کی نثر کا موازنہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابوالفضل کی طرح غالب کی بھی القاطی اپنی فرہنگ ہے جو اکثر آئین اکبری سے ماخوذ ہے۔ بلکہ آخر میں تو وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ”اس ساری بحث کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فارسی مکتوب نگاری میں غالب کا سارا کا سارا اسلوب ایک بڑی حد تک ابوالفضل اور تھوڑی حد تک بیدل کی نقل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس سامان سے انھوں نے اپنا مکان سجایا ہے اصل میں یہ سارا سامان ہی دوسرے گھر کا ہے۔“

اس ضمن میں پہلی اور سب سے وقیح بات یہ ہے کہ جس طرح انسانی رشتوں میں بزرگوں کی محبت کا دریا اپنی اولادوں کی جانب بہتا ہے بالکل اسی طرح ادب کا دریا بھی اوپر سے نیچے کی جانب بہتا ہے۔ ادب میں بھی ہر نسل اپنے پیش روؤں سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ اگر دلی دکنی نہ ہوتے تو شاہ حاتم کا وجود ممکن نہ تھا۔ اگر شاہ حاتم نہ ہوتے تو اردو میں سودا نظر نہ آتے اور اسی طرح اگر سودا نہ ہوتے تو مصحفی کا کوئی امکان نہ تھا۔ سب نے اپنے اسلاف سے کسب فیض کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ان حضرات کے گھر میں

سارا سامان و دوسروں کے گھر کا ہے اپنا کچھ نہیں الزام و اتہام تو کہا جاسکتا ہے نقد و نظر نہیں یا بقول رشید احمد صدیقی کے یہ آئین (تحقید) نہیں آرائش ہے سو اس حقیقت کو مد نظر رکھا جائے تو ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کے سارے دعاوی درست ہوتے ہوئے بھی چنداں اہمیت نہیں رکھتے اور اس کا سبب یہ ہے کہ تحقید میں تجزیہ بھی ہوا کرتا ہے لیکن تحقید محض تجزیہ نہیں ہوتی۔ یہ کام تو بڑے میکائیکی طریقے سے معمولی لیبارٹری میں بھی ہو سکتا ہے جہاں حس و وجدان کا کوئی دخل نہیں۔ تحقید تو ایک جمالی ہیکر کے جمالی ابعاد کے تعین کا نام ہے۔ لہذا اگر آپ کو تحقید کرنا ہے تو ادبی تخلیق کو اس کی کلیت میں دیکھنا اور پرکھنا ہوگا۔ جس نے بھی تاج محل دیکھا ہے اس کو معلوم ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں کن کن اشیاء کو جمع کر کے یہ صورت اور شکل دی گئی ہے اور پھر یہ اشیاء کہاں کہاں سے لا کر جمع کی گئی ہیں ... لیکن حقیقت میں قابل داد و ستادیش تو تاج محل کا وہ تصور ہے جو اس کے انجینئر کے ذہن میں ابھرا اور اپنے خال و خد کی باریک ترین تفصیل کے ساتھ کاغذ پر عکس پڑے ہوئے۔ لہذا دیکھنا یہ ہے کہ غالب نے اپنی نثر میں جس خیال کی حقیقت پیش کی ہے وہ آپ کی جمالیاتی حس کا دامن پکڑ کر طلب کار حسین ہوتی ہے یا نہیں ... الفاظ کے یہ انبار صرف ابوالفضل اور ہیدل ہی کے آچار میں موجود نہیں۔ ممکن ہے اور بھی بہت سے معروف و غیر معروف فنکاروں کے آچار میں بھی موجود ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا غالب کی سی چابک دستی، صناعی اور مہارت کے ساتھ کسی اور نے بھی ان بے جان، خاموش بے حس الفاظ کو استعمال کر کے حسن معنی اور حسن و معنی کا ایسا سحر انگیز، پراثر، متحرک دگوہا، تاج محل تعمیر کیا۔ اگر نہیں تو آپ غالب سے اس کے ذہن کی دڑاکی، عقل کی بلندی، اور فنکارانہ صلاحیت کی فضیلت چھیننے پر کیوں مصر ہیں۔ الفاظ کسی کی ملکیت نہیں ہوتے۔ یہ تو گونگے بے جان پتھر ہیں۔ ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں یہ پتھر کلمہ نہیں پڑھتے۔ اس کے لیے صیبر بالحق چاہیے اور غالب یقیناً وہ صیبر بالحق تھے۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غالب کی فارسی نثر کا اسلوب ایک بڑا پُر شوکت اور اثر انگیز اسلوب نثر ہے۔ غالب سے پہلے بھی تقریباً ہر پڑھے لکھے فارسی

وان کو معلوم تھا اور ان کے دور کا ہر عالم فاضل بھی اس حقیقت سے واقف تھا کہ اس کے منافع کہاں واقع ہیں۔ اگر غالب کے دشمنوں اور معاصرین میں سے صرف چند اہم ترین حضرات کو نظر میں رکھا جائے تو مرزا مظہر جانجاناں اور سراج الدین احمد خاں آزاد سے لے کر سر سید تک ایک طویل فہرست بن جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر نے فارسی خطوط لکھے اور بعض کے خطوط طباعت پڑ بھی ہوئے۔ لیکن باوجود اس کے کہ وہ علم و فضل و فہم و فراست میں کسی طرح غالب سے کم نہیں تھے غالب کے مکتوبات کی سحر انگیز خوبی کو نہ پہنچ سکے۔ یہاں ممکن ہے ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک مختصر مآخذ اقتباس اس امتیاز کی توجیہ کر سکے۔ وہ کہتے ہیں "غالب کی (فارسی) نثر کی دوسری ماہد الامتیاز خصوصیت ان کا شعری لب و لہجہ ہے۔ انھوں نے نثر میں شعری علائم کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ شعری تسمیحات، اصطلاحات، تشبیہات و استعارات وغیرہ اسی فراخ دلی سے نثر میں برتی گئی ہیں جیسے شعر میں۔ اس کی بنا پر ان کی نثر کا ہر ایسا شاعرانہ ہو جاتا ہے۔" اس پر ان کی بے بدل طباعتی، بے پناہ نکندہ آفرینی، حیران کن بلندی فکران کے بیان کو اور بھی دلکش بنا دیتی ہے۔ نہیں۔ دل کشی ان کی نثر کے لیے درست لفظ نہیں۔ ان کی نثر ایک قسم کا سحر ہے جو ہر صاحب فکر پر یکساں اثر کرتی ہے۔ اس نثر کے پیچھے ایک بہت بلند ذہن ہے۔ ایسا ذہن جو قدرت صدیوں میں کسی ایک کو عطا کرتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ ساری خصوصیات ہیں جن میں کوئی مکتوب نگاران کا مقابلہ نہ کر سکا اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے اعلان کردہ مکاتیب نگاری کے دستور العمل کی پیروی نہ کر سکے لیکن انھوں نے خط کو ایک دلکش ادب پارہ ضرور بنا دیا۔ لیکن ان کے مکاتیب کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ ان کے مکاتیب باقاعدہ ادب عالیہ کا ایک گراں اثاثہ ہیں اور یہی ان کے مکاتیب کی خالی بھی ہے کہ وہ مکتوب نگاری کے خود اپنے بنائے ہوئے اور مسلک اصولوں پر چرے نہیں اترے۔

کتابیات و مقالات

- ۱۔ "نعت نامہ" دہلوی۔ تالیف علی اکبر دہلوی۔ چاپ شدہ و تخریج ۱۳۳۷ شمسی
- ۲۔ "پادشاهت" ۱۲۶۸ھ۔ مطبع حای دیلی محمد یار سوم مطابق خزانہ عبدالمؤمن خان
- ۳۔ "غائب" معتمد نظامی کی نگار بنا۔ دیوبند عبدالحق یارون رود کراچی اشاعت اول ۱۹۹۸
- ۴۔ "کلیات نثر غالب" ۱۲۸۹ھ مطبع نول کشور
- ۵۔ "کلیات نثر غالب" ۱۲۸۹ھ مطبع نول کشور
- ۶۔ "نامہ ہائے فارسی غالب" مرتب علی اکبر ترمذی۔ مطبوعہ غالب اکپڈی دیلی
- ۷۔ "آج کل" جلد اول و ثانیہ نگار غالب کراچی۔ مرتب و محرم بہ قزوین مطبع اول ۲۰۰۲
- ۸۔ "۱۲۳۲ غالب" فتح محمد اکرام۔ تشریح غلام محمد علی رود بخینی چھاپہ پٹن
- ۹۔ "خطوط غالب" ڈاکٹر غلام رسول مہر
- ۱۰۔ "ڈاکر غالب" معتمد ملک رام۔ مکتبہ شعر و ادب سن آ پارہ لاہور
- ۱۱۔ "غائب" شخصیت اور عہد چون نگار ویرانہ ادارہ ادبیات اردو۔ پتھر گھر۔ حیدرآباد۔ انڈیا
- ۱۲۔ "عمود ہندی" مرتبہ مرتضیٰ حسین قاضی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷
- ۱۳۔ "عمود ہندی" مرتبہ مرتضیٰ حسین قاضی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷
- ۱۴۔ "تاریخ ادبیات سلطان پاک" دہلوی، طالب بوندیشی
- ۱۵۔ "تاریخ زبان فارسی" معتمد ڈاکٹر غلام سرور۔ طابع مرکز تحقیقات لاری ایران و پاکستان
- ۱۶۔ "تجربہ اولیا" مرتبہ ڈاکٹر غلام سرور۔ طابع مرکز تحقیقات لاری ایران و پاکستان
- ۱۷۔ "کلیاتی بہار مجملہ" ۱۱۹۸ھ۔ مطبعہ سید فائز علی۔ مطبع انوار محمدی
- ۱۸۔ "غائب کی فارسی نثر نگاری" (غائب پر چند مقالے) بروفسر غلام محمد
- ۱۹۔ مقالہ: مرزا غالب کا اسلوب نگارش۔ ڈاکٹر عبد الباقی

غالب کے دینی و مذہبی عقاید

دنیا کا ہر شاعر، ادیب، مصور اور تخلیقی فن کار اپنے معاشرے سے شاکی ہوتا ہے۔ اس معاشرے کا نظام اقدار و اخلاق ہی اس کو کہتا ہے معنی و فضول نظر آتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو بلکہ حقیقتاً اس کی وجہ یہی ہے کہ تخلیق کار ہونے کے ناتے وہ اپنی چھوٹی سی دنیا کا ایک خدا ہوتا ہے اور اس لیے اپنی کائنات میں صرف اپنے نظام اقدار کو کار فرما دیکھنا چاہتا ہے۔ غالب بھی شاعر ہونے کے سبب وہی انایت لے کر پیدا ہوئے جو ایک خدا کو رعب دیتی ہے اور اسی لیے اپنی شریعت اپنے ساتھ لائے۔ نتیجتاً جس شریعت میں آنکھ کھولی اس کی طرف سے کہیں آنکھیں بند کر لیں اور اس کو درخور اعتناء نہ جانا۔ اور چوں کہ شاعر بھی عظیم تھے اس لیے ان کی ناکا بھی اتنی ہی عظیم تھی۔ قول و فعل میں رتق و برابرفرق نہ رکھا کہ شانِ خدا وندی کے خلاف تھا۔ اور ایسے عہد میں جب لوگ دین و مذہب کے خلاف شاعری میں بھی اپنی آزادانہ رائے کے اظہار سے گریز کرتے تھے، بیاہنگِ دہل اعلان کیا کہ میں شراب پیتا ہوں اور روز پیتا ہوں، تمہارے نظام سزا و جزا پر ایمان نہیں رکھتا، تمہاری جنت بھلا مہری زندگی کے دکھوں کا کیا مداوا کر سکتی ہے اور اگر میرے بس میں ہو تو ریاضِ رضوان کو بیچ بازار بیچ ڈالوں۔ غرض دین کی طرف ان کا بھڑکی ہو یہ وہی تھا جو ہمیشہ ہر عظیم تخلیقی فن کار کا ہوتا ہے۔ یعنی:

جاتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد

پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی

گو یا دیدہ و دروں پر یہ ظاہر کر دیا کہ حضرات میرا دینی رویہ کسی ناواقف کی یا عدم اوراک کی بنا پر نہیں۔ ثواب طاعت و زہد کو ابھی طرح سمجھتا ہوں، پند میری اتنا کو یہ تقلید کو ارا نہیں اور اس لیے اس بے سنی جیروی سے ابا کرتا ہوں۔ اور پھر اپنے اوراک کے اور اپنی ذاتی شریعت کی فضیلت کے ثبوت میں انھوں نے جنت و دوزخ، حور و قصور، سزا و جزا، حلال و حرام، سہ و انگلیں، طوطی و کوثر کے تمام تصورات کو یک قلم مسترد کر دیا۔ نتیجتاً ساری زندگی اپنی شریعت پر جو وسیع الشربتی، صلح کل، عظمت انسانیت، مروت و ہمدردی اور آفاقی اخوت پر استوار تھی عملاً کار بند رہے اور شاعری میں بھی مسلسل ان ہی اقدار کا پرچار کیا۔ ”انگھار و گمراہی کی یہ ہم آہنگی ہی ان کی شخصیت و فن کی عشت ازل ہے۔ غالب کا فن ان کی شخصیت کا بھی مکمل انگہار ہے۔ مختصر یہ کہ ان کا اعتنائی کامیاب تنقیدی مطالعہ اور محنت سے مرتب کی ہوئی سوانح عمری بھی اپنے بارے میں ان کے اقوال و آرا کی تخریج سے باہر نہیں جاسکتی۔“ لہذا اگر ان کی شاعری اور سوانح کو مجموعی طور پر نظر میں رکھا جائے تو دینی عقاید کی طرف ان کے رجحانات کو دو وسیع خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو مجموعی طور پر دین کی طرف۔ دوسرا مخصوص روپیہ دینی جزئیات یا مذہبی عقاید کی طرف۔ ذیل نظر ضمنوں میں ان کے ان ہی دونوں رویوں کو دیکھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلے میں آپ کی خدمت میں ان کے مجموعی دینی رویے کی مثالیں پیش کرتا ہوں۔ یہ مثالیں ان کی شاعری سے بھی لی گئی ہیں اور ان کے مکاتیب سے بھی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں ان کا ایک وہ شعر پیش کرتا ہوں جو ان کی آفاقی اخوت پر دلالت کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ وہ مذہب کی بنا پر انسانیت کی تفریق پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

فکریکدہ اس شعر میں اسی آفاقی اخوت کا استعارہ ہے۔

بحث و جدل بجائے مائیکدہ جوی کامدراں
کس شمس از نخل نزد کس تخن از فکد خواست

اور پھر کہتے ہیں کہ مذہب کی فرسودہ رسموں کو نہ صرف ترک کرنا بلکہ ان کی عملی مخالفت کرنا چاہیے۔

فرسودہ رسم ہائے عزیزاں فروگذار
 درسور نوحہ خوان و بہ بزم عزا برقص
 اسی طرح کہتے ہیں کہ دین ہم جیسے بالغ نظر لوگوں کے لیے نہیں یہ تو بے شعور و
 ناگاہ لوگوں کے لیے ہے۔

ہاں! میاویز اسے پھر فرزندِ آذر راگر
 ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد
 اب میں غالب کے وہ خیالات پیش کرتا ہوں جو سزا و جزا، طلال و حرام، روزِ بخ و
 جنت، حور و قصور کوثر و طوبے، نماز و روزہ، وضو و طہارت یا اس قسم کے جزوی پہلوؤں کے
 بارے میں ہیں۔ ان خیالات کا اتنی باقاعدگی اور تسلسل سے ان کی تعلیقات میں بیان ہوا
 ہے اور ان کے اظہار میں خیال کے ایسے ایسے زاویے اور پہلو ہیں کہ بعض اوقات اگر
 ایک عنوان کے دس اشعار بھی مثال کے طور پر پیش کر دیے جائیں تو یہ خیال دامن گیر
 رہتا ہے کہ اس عنوان کی صحیح نمائندگی نہیں ہوئی۔ چنانچہ طوالت سے بچنے کی خاطر ان
 جزوی موضوعات سے ایک دواورد اور قاری کی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

حور و کوثر

یا دوست ہر کہ بادہ مظلوت خورو عام
 دانم کہ حور و کوثر و دارالسلام چیست

جنت و بہشت

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
 دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

بشتے ہیں جو بہشت کی تشریف سب درست
 لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

بارغِ رضوان

ستائشِ گر ہے زاہد اس قدر جس بارغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خردوں کے طاقِ لیاں کا

جنت

جنت نہ کند چارہ افسردہ گئی ما
تغیر ہمارا دیوانی مانیت
کوثر طوئے بارغِ رضوان و شرابِ طہور

برجائے

رجوت زہد تا حضور اللہ
خواہی تو دارا کیر خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوئے کہ نشانے دارد
سر چشمہ و سایہ الیت درمے راہ

واعظ نہ تم سے نہ کسی کو چلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

رضواں چہ شہد و شیر بہ غالب حوالہ نرود
بے چارہ باز داد و مئے مشکبو گرفت

درمژدہ ز جوئے عسل و کارخ زمرد
چیزے کہ بدل بنگلی ارزد مئے ناب است

خوش است کوثر و پاک است ہادۂ کہ در دوست
از آن رحتی مقلدں درایں شمار چہ جھ

احکاماتِ امر و نہی

لا تقربوا الصلوة و انتم بغافلہ است
و زامر یاد مانده کلو و شربو مرا

صوم و صلوٰۃ

برپائی

در عالم بے زبری کہ تلخ است حیات
طاعت نتوان کرد یہ امید نجات
اے کاش زحق اشارت صوم و صلوٰۃ
بودی بوجد مال چوں حج و زکوٰۃ

طہارت و وضو

تو بیک قطرہ خوں ترک وضو گیری و ما
سکلی خوں از مژہ رانم و طہارت نہ رو

نماز

افتادگی نماز دل ناتوان ماست
درد سر قیام و قعودش نمائندہ است

انکسار و تواضع

تکی زتست از تو نہ خواہیم مزد کار
در خود بدیم کار تو ایم انکسار چیست

تماشاے نکش قنارے چیدن
بہار آفرینا کنکار ہیں ہم

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے کھسے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

حلال و حرام

دل نسخہ عمیم دیوے دوائے ما
باحتکاں حدیثِ حلال و حرام جیست

مقصد طاعت

طاعت میں تار ہے نہ سے وانگیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

مزد عبادت و بخشش صالح

ربانی

آں را کہ عطیے ازل در نظر است
ہر چند بلا بیش، طرب بیش تراست

فرق است میان من و منہاں در کفر
بخشش و گر و مزد عبادت و گراست

اشتقاقی حراز

مخمر مکافات پہ غلد و ستر آہ
مشتاق عطا شعلہ زکلی باز ندانست

یہ تو شاعری کی بات ہوئی اس نئی دینی روپیہ کی طرف ان کے بہت سے دانشور
اطلاعات و بیانات ان کی زندگی کے احوال و سوانح میں بھی ملتے ہیں۔

ج: ”منا ہے کہ جب کرل بدون کے رو برو گئے تو اس وقت نکلا
پاپاخ ان کے سر پر تھی۔ انھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا۔
دل تم مسلمان؟ مرزا نے کہا آدھا۔ کرنیل نے کہا اس کا کیا
مطلب۔ مرزا نے کہا شراب پیتا ہوں سو نہیں کھاتا۔“

ج: ”بیچ کا چھپانا آزادوں کا کام نہیں ہے میں آدھا مسلمان کہ
جس طرح قید کشیا ملت سے آزاد ہوں اسی طرح بدنامی اور
رسوائی کے خوف سے وارتہ ہوں۔ میری مدت سے یہ عادت تھی
کہ رات کو فرنج (شراب) کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا اور اگر وہ نہ
ملتی تھی تو نیند نہ آتی تھی۔ اگر جوان مرد خدا دوست، خدا شناس،
دو یا دل ہمیش داس ہندوستانی شراب جو رنگ میں فرنج سے مشابہ
اور یو میں اس سے بہتر تھی، مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز جانبر نہ ہوتا۔“

از دیہ دلم واسی ز ہر دری بخت
از بادۂ تاب یک دو ساغری جست
فرزادہ ہمیش داس کشید بہ من۔
آپے کہ برائے خود سکندری بخت۔“

ج: ”ساری عرق و فخر میں گزری۔ نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ نہ
کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انڈاس رہ گئے ہیں اگر چند روز
بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں
کی صفائی کیوں کر ہو سکے گی۔۔۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موعظ
ہوں۔ ہمیشہ تہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر
رہتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ لا معبود الا اللہ لا معبود الا اللہ لا معبود الا اللہ۔“

۱۰ "ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تھا تو قلعے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے۔ عرض کیا چار و مرشد ایک نہیں رکھا۔"
 ۱۱ "ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعے پر نہایت افسوس کرتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمان کی نہیں ہے پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی وقت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے۔"

مرزا کے فکری اور عملی رویے کو مجموعی طور پر نظر میں رکھیں تو لازمی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ لاکھ بے عمل سنی لیکن پھر بھی ان کے کچھ تو دینی و مذہبی اعتقادات ہوں گے۔ سو وہ اعتقادات کیا تھے۔ اس ضمن میں شیخ اکرام نے بڑا پامناہی جملہ لکھا ہے کہتے ہیں۔
 ۱۲ "ایک اور دلچسپ مسئلہ مرزا کا مذہب ہے۔ ان کی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ انھیں مذہب سے دلچسپی عوام سے زیادہ رہی ہے۔" اور پھر اس تمہید کو دست دیتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ کس طرح انھیں مختلف مذاہب اور ان کے معتقدات و معارف سے گہری دلچسپی تھی اور کس طرح وہ مختلف مذاہب پر تالیف کی گئی اپنے دور کی مستند کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ گویا ان کے سارے اظہارات کے پیچھے وہ عملی ہوں یا عقلی، نثر میں یا نظم میں گہری فکر کا رفرما تھی۔ گفتگو میں وہ لطائف و مطاببات ہوں، مکاتیب میں محض عرض احوال واقعی اور نظم میں صرف اشعار لیکن ان سب میں ان کی فکر ضرور شامل حال ہوتی تھی۔"

حانی نے 'یادگار غالب' میں ص ۴۷ پر ان کے معتقدات کا خلاصہ کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔ ۱۳ 'مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید و جود کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے مگر جیسا کہ کہا گیا ہے سن احباب یا اکثر ذکر توحید و جود ان کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی... انھوں نے تمام عبادات و فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید و جود اور دوسرے اہل بیت کی محبت۔ اور اسی کو وسیلہ نجات جانتے تھے... اور

اکثر جس طرح حکمائے اسلام نے فہمِ جسمانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اس کے قائل نہ تھے۔ "پھر ص ۶ پر فرماتے ہیں۔ "اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلحِ کل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان طبعِ تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جنتاب امیر کو وہ رسولِ خدا کے بعد تمام امت سے افضل مانتے تھے۔"

شیخ اکرام نے بھی ان کو عقیدۂ اثنا عشری ہی بتایا ہے نہ اور قبولِ مالکِ رام الٰہ وہ ساری عمر کھلے بندوں اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کرتے رہے اور اس میں ان کے مخالف سنی شیعہ دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے بزرگ تھے۔ "یہ اعلانات بحیثیت تعداد اسنے زیادہ اور بحیثیت تو اثر اس قدر ہیں کہ ان کو کسی خاص جذبے یا میلان سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ گویا یہ ایک شاعر آزادہ کیش و رند مشرب کا آواز و سرمستی و ہوسے سرشاری نہ تھا اور نہ ہی ان کو کسی خاص دینی و دنیاوی منفعت کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ پھر اگر ان دعوؤں کی پوری عمر کا تعین کیا جائے تو وہ غالب کی زندگی کے بیشتر حصے پر جس میں لڑکپن شامل ہے محیط نظر آتے ہیں۔ سو آج کا عقیدت پسند حراج اس بات کا ثبوت مانگتا ہے کہ وہ حقیقۃً اثنا عشری تھے۔

ظاہر ہے اس کے ثبوت کے لیے سب سے زیادہ اہم شواہد تو ان کے اپنے بیانات ہی ہیں۔ لیکن ان کے اپنے بیانات کے ساتھ ساتھ Circumstantial evidence بھی کم اہم نہیں۔ اب اگر ان کے گرد و پیش کے حالات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ آبائی شیعہ نہ تھے بلکہ (شیخ اکرام) اور اس بات کا وہ خود بھی اعلان کرتے ہیں "مظہامِ کار بہ نجف اشرف برسم و حرار آں را کہ از کیش آبا یم بدر آورد و بنود کشید بکرم، مستانہ جان و ہم و سر بالاش خاتم۔" مولانا جاتی بھی لکھتے ہیں کہ "جہاں تک ہم کو معلوم ہے مرزا کے والد سنی اہلِ مذہب تھے۔" اور یہی بات مولانا محمد حسین آزاد نے بھی آپ حیات میں لکھی ہے۔ یوں تو ان کے نانہال کے حالات و احوال پہلے ہی نہ ہونے کی حد تک ہیں چہ جائے کہ ایسی مثبت شواہد جن سے ان کے اثنا عشری اثرات کے ثبوت ملتے ہوں۔ سو ان کی شیعیت کے شواہد وہاں بھی دریافت نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان کی شیعیت کا ثبوت ان کے

اپنے اطلاعات ہی رہ جاتے ہیں۔ سو آئیے دیکھیں وہ اطلاعات کیا ہیں اور ان کو کہاں تک اشاعتی بناتے ہیں۔

نواب غلام الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۱۳۱۲ھ میں موعدہ خاص اور مومن کامل ہوں۔ انبیاء سب واجب التحظیم اور اپنے اپنے وقت میں منفرض الاطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین ہیں۔ مطلق نبوت کا مطلق امامت اور امامت نہ انتحالی بلکہ من اللہ علیہ علیہ السلام ہے۔ ثم حسن، ثم حسین، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام۔

ع ہدی دہستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عامی سمجھتا ہوں۔ ”یادگار غالب“

اب میں سید علی علیہ السلام کے نام غالب کے ایک قاری مکتوب کے طویل اقتباس نکا اردو ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ یہ اقتباس غالب کے شیعہ عقیدے پر قول فیعل کا حکم رکھتا ہے۔

”اچھا اب رباعیات کے ضمن میں بات ہو جائے خدا یا میرا بیان پیر و مرشد کے خلاف (مزاح) نہ ہو۔ شروع کی تین تحریر شدہ رباعیات کا مضمون یہ تھا کہ حضرت علیؑ خلیفہ تھے۔ (لیکن) میرا یہ عقیدہ نہیں میں علیؑ کو امام سمجھتا ہوں اور دوسروں کو خلیفہ۔ خلافت (وراصل) سلطنت اور ریاست کے مترادف ہے۔ عرب کی زبان میں رئیس یا حاکم کو خلیفہ کہتے ہیں اگرچہ خلافت کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ مختصر یہ کہ نبی کے بعد حضرت علیؑ امام بلا فصل ہیں اور امامت من باب اللہ ہوتی ہے اور علیؑ امام ہیں، حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے زمانے میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں بھی اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں بھی اور یہ جو مشہور ہے کہ حضرت علیؑ، حضرت عثمانؓ کے بعد خلیفہ ہوئے تو یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب امام برحق حضرت علیؑ رتقی رسول پاک کے بعد امام ہوئے تو انھوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو خلیفہ بنا کر حکومت کا کام ان کے سپرد کر دیا کہ مسلمانوں کو خطرات سے محفوظ کریں اور مسلمانوں پر حکومت کریں۔

اس کے بعد (انہوں نے) عمر کو منتخب کیا اور اس کے بعد خلافت حضرت عثمانؓ کے سپرد کی۔ ان تینوں نے اپنے آپ کو ان کے حوالے کیا اور نبی اور امام کی اطاعت کی۔ عثمانؓ کے بعد مسلمانوں میں کوئی شخص حکومت کے لائق نہ مل سکا اور جس نے اس کی آرزو کی وہ بھی اس لائق نہیں تھا۔ لامحالہ امام وقت نے قضا کا کام خود سنبھال لیا اور مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے میں لگ گئے۔ بادشاہ اگر قاضی کے فرائض انجام دینے لگے تو اس کو قاضی نہیں کہتے۔ غرضیکہ یقیناً علیؓ ہی اپنے مہد میں امام ہیں لیکن بعد میں خلافت حضرت عثمانؓ سے بنی امیہ میں منتقل ہو گئی اور اس جماعت سے آل عباس کو بچنی اور ان دونوں گروہوں نے خلفائے راشد کے برعکس ظلم و ستم کیے اور خون ریزیاں کیں اور حضرت علیؓ کی امامت کو اور اولاد علیؓ کو مٹایا اور اللہ کو مار ڈالا۔“

درحقیقت جب تک سید علیؓ کے خطوطِ غالب کے نام اور غالب کے خطوط ان کے نام دریاخت نہیں ہوئے تھے، غالب کی ساری شہیت ان کے اپنے دعوؤں کے علاوہ جو طویل نثری بیانات کی شکل میں کم اور مکتوبات کے اختتامی جملوں یا اشعار کی شکل میں زیادہ تھے، ان کی مدح علیؓ میں غلو کے سبب تصور کی جاتی تھی۔ عام طور پر شیعیت کے لیے خُب علیؓ کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے چاہے کوئی سنی عقیدہ کا کیوں نہ ہو۔ ”شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جو اپنی کتاب تحفۃ اثنا عشریہ کی وجہ سے شیعوں کی مخالفت میں کافی مشہور ہیں خود اپنا واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضرت علیؓ کے فضائل بیان کیے تو میرا ایک طالب علم ناخوش ہو گیا اور اس نے مجھے شیعہ کہہ لیا۔“ اگرچہ میں اس کو کوئی مستند دسکہ بندہ روئے نہیں سمجھتا اور وہ اس وجہ سے کہ عمومی تعصب سے قطع نظر اردو اور فارسی شاعری کی ابتدا سے آخر تک صاحب علم و عرفان سنی حضرات بھی جس طرح حضرت علیؓ کے باب میں عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں، وہ اہل تشیع سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن غالب کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور مکاتیب میں لکھے گئے اختتامی الفاظ اور جملوں نے مثلاً۔ ① ”غالب اثنا عشری حیدری“ بنام غلام حسین قدر علی گراہی ② ”بندہ علی ابن ابی طالب، اسد اللہ المستخلص الطالب۔“

ایام محمد حسین نا خدا شیرازی (۵) ”خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام یہی ہے مذہب حق و اسلام والا کرام (۶)۔ علی علی کیا کر اور فارغ الہال رہا کر۔ تمام مجروح۔ غرض ان اختتامی جلسوں اور خطوط کے مصحفی اطلاعات نے حبِ علیؑ کے ساتھ مل کر بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ غما دیا کہ وہ اثنا عشری ہیں۔ لیکن قریبی عزیزوں اور دوستوں نے پھر بھی ان اطلاعات کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ ان کے دفن کے وقت ۱۲۸۱ھ ”سید صفدر سلطان خیرۃ بخشی محمود خاں نے قواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین کریں۔ مگر قواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے مطابق ادا کیے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ قواب صاحب سے زیادہ ان کے مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور سنی دونوں مل کر علاحدہ علاحدہ ان کے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں ان کا برتاؤ سنی اور شیعہ دونوں کے ساتھ یکساں رہا تھا مرنے کے بعد بھی، دونوں فرقے ان کی حق گزاری میں شریک ہوتے۔“ گویا غالبؒ کے اپنے قریبی عزیز بھی ان کے ان دعاوی کو ان کے فکری مصلحت نظر سے زیادہ اہمیت نہ دیتے اور ان کو شیعوں کے مروّجہ و عملی معیارات کے مطابق اثنا عشری ماننے کو تیار نہ تھے۔ اور اس رویے کے ذمے دار بہت سے ایسے اسباب تھے جو مندرجہ بالا اطلاعات کے خلاف کارفرما نظر آتے تھے۔

ان کے اسباب میں سب سے پہلا امر تو یہی حقیقت تھی کہ غالبؒ کے ارد گرد قریب یا دور وادھیال یا ناہال میں کسی جگہ کوئی ایسا بیحد نہ تھا جو اثنا عشری ہو۔ پھر ان کی نسلی تاریخ کو نظر میں رکھا جائے تو یہ ممکن بھی نہ تھا۔ اس ہی حقیقت کا اظہار غالبؒ نے خود اپنی ربائی میں اس طرح کیا۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری

دہری کیونکر ہو جو کہ صوفی
شیعی کیوں کر ہو مادرِ انیسوی

حالی نے اس رہائی کے چننے اور بہادر شاہ کو سنانے کا واقعہ لطیفہ کے عنوان کے تحت لکھا ہے جو اتفاق سے غالب کے دینی رجحان ہی کی نہیں غالب کی نسبت دوسرے لوگوں کے خیالات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ یعنی غالب چوں کہ خود دین اور دینی احکامات و اعتقادات کی طرف انتہائی لاپرواہی رکھتے تھے اس لیے دوسرے لوگ بھی کہ ان کے دوستوں میں سے ہوں یا عزیزوں میں معتقدین میں یا پرستاروں میں، ان کے اظہارات کو چنداں سنجیدہ تصور نہیں کرتے تھے۔ پھر وائیکاف تضادات کا شور بھی ہو، تو یہ آواز اور بھی انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس ہی رہائی میں غالب خود ہی اپنے اثنا عشری نہ ہونے کا نہیں بلکہ نہ ہو سکنے کا دوسرا سبب یہ بتاتے ہیں کہ وہ صوفی بھی ہیں۔ اب صوفی جس طرح دہری نہیں ہو سکتا اسی طرح اثنا عشری بھی نہیں ہو سکتا۔ ”غور کرنے کی بات یہ ہے کہ وہ شیعیت کے تمام مسلمہ تصورات کے برخلاف تصوف میں دلچسپی لیتے اور اس کا برملا اعلان کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا یہ اذکار صرف قول ہی کی حد تک نہیں۔ وہ حضرت مولانا فخر الدینؒ کے پوتے مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے سے بیعت بھی تھے۔ کون کفر شیعہ کسی غیر شیعہ سنی صوفی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔“ (مالک رام) اسی موضوع پر پھر مالک رام ”ذکر غالب“ ہی میں ص ۲۳۸ پر کہتے ہیں ”شیعیت کو اگرچہ کلیہ کی حیثیت سے تو بے شک نہیں لیکن بالعموم تصوف سے ایک جبر ضرور رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شیخ اور بیعت کا تصور سرے سے مفقود ہے۔ بقول سید علی ہنگراہی شیعہ حضرات کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے اس لیے جبر ہے کہ ان سے ان کی آدمی سلطنت چھن گئی۔ اگر ان حضرات صوفیہ کی تعلیم نہ ہوتی تو آج سب مسلمان شیعہ مسلک کے جبر ہوتے۔ خیر یہ تو لطیفہ ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شیعہ صوفی نہیں ہو سکتا۔“ ان حالات میں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کو اثنا عشری کس طرح مان لیا جائے۔

ان کے شیعیت کے دعاوی اس وقت تک ضرور ناقابل تردید رہے جب تک وہ
 ”خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام“ اور بدست علی تک محدود رہے۔

عالم ہے رجب فہم و تصور سے کچھ پرے
 ہے ہجر بندگی جو علی کو خدا کہوں

اسد کیوں نہ ہو امید لطف بندہ نوازی
 علی ولی اسد اللہ جانشین نبی ہے

اے اسد مایوس مت ہو از در شاہ نجف
 صاحب دلہا وکیل حضرت اللہ ہے

لیکن جب انہوں نے اپنا عشری مسلک رفتہ رفتہ اپنے مکاتب میں زیادہ وضاحت
 سے بیان کرنا شروع کر دیا اور جو قدرے دیر سے دریافت ہوا تو ان کی شیعیت کا چارہ بھی
 چاک ہونے لگا۔ خلیفہ حضرت جی ٹیکن کے مکاتب میں وہ بڑے واضح طریقے سے کہتے
 ہیں کہ ”من علی را امام و ائمہ و دیگران را خلیفہ۔ خلافت بعد از نبی امام است و امام
 امریست بی دانی و علی امام است ہم در عہد خلافت ابوبکر و ہم عہد خلافت عمر و ہم در عہد
 خلافت عثمان و امین کہ مشہور است علی بعد از عثمان خلیفہ شد غلط است اصل این است کہ
 امام بر حق علی مرتضیٰ چوں بعد از رسول امام شد ابوبکر صدیق را خلیفہ کردہ امر قطعیہ و پیر
 تا قطع خطرات مسلمین نماید و بر مؤمنین فرمان روا یا شدہ پس از عمر را برگزیدہ و از و بعد عثمان
 را خلافت داد۔ اس پر سر تن بیدا و پیر و نمود نبی و امام را اطاعت کردہ۔“ اس بیان میں نہ
 صرف یہ کہ ”خلافت دینی اور مادی امور سے متعلق ہے اور امامت دینی اور روحانی
 امور سے اور اسی وجہ سے من چاہب اللہ ہے۔“ شیعہ عقیدہ نہیں بلکہ یہ سارا بیان کہ
 حضرت علی نے تینوں خلفا کو خود مستند خلافت پر بٹھایا کہ مسلمانوں کو خطرات سے محفوظ
 کریں اور ان پر فرماں روائی کریں، سنیہ بند شیعہ عقیدہ نہیں۔ بلکہ خلافت کے موضوع پر

ان کے بنیادی عقیدے کے بالکل خلاف ہے۔

ذکر غالب میں م ۲۳ پر مالک رام غالب کی رہائی:

۳۳ ”شرطست کہ ہر خطبہ آداب و رسوم

نیز بعد از نئی امام معصوم

راجماع چہ گوئی، بہ علی باز گرائی

مہ جائے نصیب صبر باشد نہ نجوم

تحریر کر کے کہتے ہیں ”ہم ان کی شیعیت کی مختصر گفتگوں میں یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ اس کا امتیازی نشان حمزہ نہیں بلکہ قولہ ہے یعنی وہ عموماً دوسرے صحابہ پر حمزہ نہیں کرتے بلکہ حضرت علیؑ سے اپنے قولہ اور محبت کا شدت سے اظہار کرتے ہیں“ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مردِ بدِ اثنا عشری مسلک میں حمزہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ منطقی طور پر خلیفہ چاقِ فصل کا دعویٰ غیر جانبداری اور نتیجتاً خاموش رضا مندی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔

اب آئیے دیکھتے ہیں کہ غالب کس حد تک صوفی تھے اور صوفیاء کے نظام کے کس حد تک پیرو رہے۔ یہ بات اوپر بتائی جا چکی ہے کہ غالب حضرت مولانا قمر الدین کے پوتے مولانا فصیر الدین عرف میاں کالے سے بیعت تھے۔ جب کہ بہادر شاہ ظفر بھی ان ہی کے مرید تھے۔ غالب قید خانے سے باہر آنے کے بعد کئی ماہ تک میاں کالے ہی کے مکان میں قیام پذیر رہے تھے۔ اس کے علاوہ میاں کالے کو اپنے لیے اور ان کے مکان کو اپنے مال و اسباب کے لیے وہ ایک محفوظ پناہ گاہ بھی تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ غدر کے دوران ان کی بیگم نے اپنا سارا قیمتی اسباب و زیور میاں کالے ہی کے گھر رکھوا دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ان کی سوانح میں آچکی ہے کہ دربارِ دہلی کی ملازمت بھی ان کو میاں کالے ہی کے ایما پر دستیاب ہوئی تھی۔ سو غالب کا صوفیاء سے تعلق اس حد تک ہی ہماری معلومات کا حصہ رہا۔ الہت وحدت الوجود اور اس سے متعلق موضوعات ان کی فکری دنیا کے محور و مرکز ضرور رہے لیکن فی الحقیقت ہم ان کی بات نہیں بلکہ طریقہ میں غالب کی عملی سرگرمی کی بات کر رہے ہیں۔ یعنی بیعت کے بعد آیا وہ یہ حیثیت ایک مرید

کے طریقت کے نظام عمل پر بھی کار بند رہے یا نہیں اور اپنے جبر و مرشد کے ارشادات کے مطابق ان وظائف و ریاضات پر عمل جبراً رہے جو ایک عام مرید کے لیے عام حالات میں ضروری ہیں۔

انہوں سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں اس بارے میں کسی قسم کے شواہد نہیں ملتے۔ البتہ ایسے شواہد ضرور ملتے ہیں جو مخالف سمت میں رہنمائی کرتے ہیں اور وہ ان کے اپنے ہی بیانات ہیں جو مختلف مکاحیب میں بکھرے پڑے ہیں۔ ”ساری عرق و فہم میں گزری۔ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ نہ کوئی نیک کام کیا۔ تصوف سے میرا کیا تعلق اور درویشی سے مجھے کیا نسبت۔ میرا حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وحدت وجود اور اشیا (موجودات) کا معلوم ہونا میرے ضمیر میں ڈال دیا گیا ہے اور حق محسوس ہے اور خلق معقول، میرا عقیدہ بنا دیا گیا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ صرف ایک موجود ہے اور اس کے سوا کچھ موجود نہیں ہے۔ اس کے سوا میری ہمت، کوشش و ریاضت اور دولت و مال ایک دو شراب کے پینالوں پر منحصر ہے جو رات کو پی لیتا ہوں اور مست ہو کر سو جاتا ہوں۔ نہ دین سے واقف ہوں نہ دنیا سے۔ اللہ بس ماسوا ہوں“ (ترجمہ خط بنام حضرت جی ٹنگین)۔

ان تحریری و اقراری انکشافات و بیانات کے ساتھ ساتھ ان کی ساری زندگی کا رویہ نظر میں رکھا جائے تو ان اس یقین پر پکچتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں درست ہے۔ ان کی شخصیت کا بڑا کمال ہی یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا برملا کیا اور کبھی چھپایا نہیں۔ ان میں تصنع و ریاکاری نام کو نہیں۔ ان کے اقوال و اعمال میں رتی برابر فرق نہیں اور یہاں محمد ششی کا قول ذریں دوبارہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ”ان کی بہت محنت سے مرحب کی ہوئی سوانح عمری بھی اپنے بارے میں ان کے اقوال و آراء سے باہر نہیں جاسکتی۔“ ان حالات میں اگر حضرت جی ٹنگین کو وہ ایک خط میں یہ لکھتے ہیں ”سید امانت علی صاحب جو حضور کے تربیت یافتہ ہیں اکثر مجھے نوازتے رہتے ہیں اور جب خلوت میسر آتی ہے تو ان سے راز کی باتیں ہوتی ہیں۔ ابھی دو تین دن ہوئے بے رنگی کا ذکر آ گیا۔ چوں کہ میں آج کل بے رنگی کے نگارے میں مبتلا ہوں اس لیے میں نے اس

بارے میں مبالغہ کیا اور میں نے کہا اس سے بلند اور کوئی مقام نہیں ہے۔ میرا منت علی صاحب نے کہا کہ اس مقام کا چھوڑنا بھی ایک مقام ہے۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے لیکن کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مقام ہے جو استغراق کی زیادتی کے بعد خود ہی حاصل ہو جاتا ہے اور اس کا حاصل کرنا مشاہدہ بے رنگی پر توجہ کرنا ہے نہ کہ اس سے قطع نظر کر لی جائے۔ "قاری کے استفادہ کے لیے بتایا جائے" "کہ شغل بے رنگی صوفیا کا ایک خاص شغل ہے جو آنکھیں کھول کر آسمان یا خلا میں نظر جما کر کیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ بے خودی اور ربودگی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جسے فنا بھی کہتے ہیں اور جس کا حصول تمام سلاسل تصوف میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ وہ اپنے صوفیانہ عقاید کے علاوہ عملاً بھی صوفی تھے اور شغل بے رنگی ان کا معمول تھا" ان کی ساری زندگی کے حقائق سے منہ موڑ لینے کے مترادف ہو گا۔

اس کی بنیادی اور اہم ترین وجہ یہ ہے کہ کسی بھی مسلک صوفیا کے لیے کوئی عملی شغل ان کے محیط طریقت سے (جو اپنے طور پر خود شریعت پر استوار ہے) باہر نہیں ہو سکتا۔ یعنی یہ سارے ریاض، مجاہدے اور روحانی مشقیں احکام طریقت کی چار دیواری کے اندر ہو سکتی ہیں اس کے باہر نہیں۔ بالفاظ دیگر ان اشغال کا کرنے والا پہلے عملی طور پر مسلمان ہو گا، اور پھر صوفیا کے کسی مستند سلسلہ سے منسلک ہو گا اور یہ مشقیں اپنے چہرہ مرشد کی ہدایات و نگرانی میں کر رہا ہو گا۔ کسی عملی مسلمان کے لیے تو بنیادی شرط روزے نماز کی ہے۔ طریقت تو شریعت کا خصوصی نصاب (specialised course) ہے۔ جو شخص شریعت میں مبتدی کی حیثیت بھی نہ رکھتا ہو وہ ذات و صفات سے متعلق ایسے انتہائی تخصیصی کورس میں کس طرح شامل ہو سکتا ہے۔ کوئی تارکب صوم و صلوٰۃ اپنے آپ کو صوفی کہلانے کا مجاز ہی نہیں چہ جائیکہ وہ اتحاد صفا کے ایسے بلند مرتبہ کورس میں شامل ہو سکے اور پھر وہ "ایک دو شراب کے پینائوں کے" دعوے کے ساتھ، جب کہ وہاں یہ ساری روحانی مشقیں بھی بادِ وضو ہی کی جاتی ہیں اور طہارت کا بنیادی تصور بھی شریعت کا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے بے رنگی کی یہ یونیورسٹی معیار کی مشقیں کس

طرح شروع کر دیں جب کہ وہ کسی مسلک کے کنٹرول گارڈن میں داخلے کے بھی اہل نہ تھے۔ سو اس ضمن میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ میاں کالے سے ان کی بیعت اپنی جگہ، جو اعلیٰ ہدایت و توقیر فضل و کمال کے خانے میں ڈالے جانے کا استحقاق رکھتی ہے، تصوف صرف ایک مسلک اور عقیدہ ہی نہیں ایک علم اور فلسفہ بھی ہے اور چوں کہ غالب مختلف مذاہب اور فلسفوں سے گہرا شغف رکھتے تھے اور ایک دژاک ذہن اور روشن دماغ کے مالک تھے ان کے لیے ہر فلسفہ کے باریک ترین نکات کو سمجھنا اور اس پر دسترس حاصل کر لینا آسان تھا۔ ان کا مختلف مذاہب خاص طور پر ہندوستان کے مختلف مذاہب کا علم یقیناً ان کا مشغلہ رہا تھا جہاں جس دم اور ارتکا و نظر (اور توجہ) کی مشقیں توڑے بہت فرق کے ساتھ سادھوؤں کا ہزاروں سال کا وطیرہ رہی ہیں۔ اس قسم کی ریاضتیں بغیر اپنی دینی نسبتوں کے بھی دنیا میں سرورج رہی ہیں اور چوں کہ ان باطنی علوم کا ہر طالب علم اپنے ریاض و مجاہدے میں تقریباً ایک جیسی منازل سے گزرتا ہے، غالب نے بھی اپنی ذہنی کاوش اور فطری صلاحیت کی بنا پر بے رنگی میں وہ صلاحیت حاصل کر لی کہ وہ اس راہ کے متوجہوں سے اس موضوع کے وقتی تجربات پر بحث کر سکیں، دوسرے کا مفہوم سمجھ سکیں اور اپنا مافی الضمیر سمجھا سکیں۔ یہی نہیں دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ روحانی واردات کے لیے کسی شاعر کا یہی طور پر صوفی ہونا لازم نہیں۔ بچے ”روحانی واردات کسی“ کہ کلام میں بھی اسی طرح موجود ہو سکتی ہے جیسے صوفی کے کلام میں۔ اغلب یہ ہے کہ روحانی واردات کے لیے رندی اور وردیشی دونوں یکساں ہیں“ ۱۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے رملو سلوک کے سارے اکتسابات کسی بیعت یا مسلسل ریاضت کے مرہون منت نہ تھے بلکہ یہ ساری چیزیں ان کے غیر معمولی ذہن کی خداواد صلاحیتوں اور ان کے فطری ذوق و میلان خاطر کے سبب تھیں جو کسی مذہبی یا دینی یا مسلکی پابندی کی برداشت کا حوصلہ ہی نہیں رکھتا تھا۔ اور اس لیے ان کو صوفیہا کے کسی خاص مسلک سے کہ جو خالصتاً ایک دینی محیط کے اندر ممکن ہے وابستہ کر دینا غالب کی آزاد روی و وسیع الشربتی اور بلند نگاہ انفرادیت کو مجروح کرنا ہوگا۔

اس ہی بات کو ذرا اور آگے بڑھاتے ہوئے اگر بعض ناقدین کی اس رائے پر غور کیا جائے کہ غالب اپنی ساری زندگی میں کس کس طرح اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتے اور اپنی بے آبروئی اور بے عزتی پر اپنا تسخیر اڑاتے رہے اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ وہ مسلک ملائحہ کے پیروکار تھے، ان کی شخصیت بلکہ ان کی بے کنار شخصیت کو اور بھی تنگ دائرے میں محبوس کرنا ہو گا۔

حضرت سید علی بن عثمان اللجوجری "کشف المحجوب" میں ملامت کی تین اقسام بتاتے ہیں اور ان کے متعلق یہ تحریر فرماتے ہیں۔ ملامت کی تین اقسام ہیں۔ ۱۔ راہ راست پر قائم رہنے کی وجہ سے ملامت کا نشانہ بننا۔ ۲۔ قصداً یعنی جان بوجھ کر ملامت کا نشانہ بننا۔ ۳۔ ترک شریعت کی وجہ سے بدنام ہو جانا۔

پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی شریعت کے مطابق کام کیے جاتا ہے اور لوگوں کی عیاج و دم کی پرواہ نہیں کرتا لیکن پھر بھی لوگ اسے ملامت کرتے ہیں۔ قصداً ملامت طلب کرنے کی صورت یہ ہے کہ جب کسی بزرگ کی غلطی خدا میں بہت قدر و منزلت ہوتی ہے جس سے اس کے دل میں خود پستی پیدا ہوتی ہے تو اس کا علاج وہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ایسا کام کرتے ہیں جو شریعت کے خلاف نہ ہو لیکن لوگوں کو خلاف شرع نظر آئے۔ اس سے ان کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ لیکن لوگ ان سے متنفر ہو جاتے ہیں اور ملامت کی زبان دراز کرتے ہیں۔ اور ملامت کی تیسری قسم یعنی ترک شریعت یہ ہے کہ کفر اور گمراہی میں ایک شخص مبتلا ہو جائے اور شریعت کے خلاف کام کرے لیکن لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ میں نے طریق ملائحہ اختیار کیا ہے۔" ظاہر ہے کہ ان تمام شرائط میں سے غالب کوئی شرط پوری نہیں کرتے اور اس لیے تحقیقی اعتبار سے وہ اس دائرہ سے بھی (جو تنگ ترین ہے) خارج ہیں۔

اس ساری بحث کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خالص اصطلاحی معنی کے اعتبار سے غالب صوفی بھی نہیں کہلائے جاسکتے۔ لے دے کے ایک چھوٹا سا مسئلہ عقیدہ، فہم حسراتی کا رہتا ہے۔ اس بارے میں حاتی لکھتے ہیں "معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکمائے اسلام

نے نعیم جسانی سے انکار کیا ہے، مرزا بھی اس کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ اعزاز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے
یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔

رباعی

گردینِ زاہداں بہ جنت گستاخ
واں دستِ درازی بہ ثمر شاخِ بطراخ
چوں نیک نظر کنی دروئے تھیبہ
ماند بہ بہائم و حلفِ دارِ فراخ

تقریباً یہی رائے شیخ محمد اکرام نے دی ہے۔ وہ کہتے ہیں ”مرزا کے کئی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ روزِ جزا یا جسانی عذاب و اجر کے قائل نہ تھے۔۔۔ جہاں کہیں انھوں نے بہشت کا ذکر کیا ہمیشہ شوخی اور تسخیری سے کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دورِ عباسیہ کے کئی مسلمان تھکایا سرسید احمد خاں نعیم جسانی کے منکر تھے اسی طرح مرزا کی رائے بھی اس معاملے میں تمام مسلمانوں سے مختلف تھی۔“

بعض اہل الرائے نے مندرجہ بالا آرا کو قابلِ اعتماد جانتے ہوئے اس موضوع پر تحقیق کی ہے اور غالبؔ کے چند اشعار جنت کے عنوان پر ایسے پیش کیے ہیں جن سے غالبؔ کی تنبیہ طلب جنت کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً:

خلد بہ غالبؔ سپارِ دانکہ بیداں روضہ در
نیک بود عندلیبِ خاصہ نو آنیں نوا

یا

بہ نشت تو دوزخِ جاویدِ حرام است
حاشا کہ شفاعت نہ کنی سونچیاں را

وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جس طرح حاتی نے کہا ہے ”شاعر کے کلام سے اس کے عقاید پر استدلال نہیں ہو سکتا۔“ میں بھی اس رائے کو درخور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے شیخ اکرام کی پیش کی گئی رائے کے آخری جملے کو ”جس طرح دور عباسیہ کے مسلمان حکمایا سرسید احمد خاں ضمیمہ جسمانی کے منکر تھے اسی طرح مرزا کی رائے بھی اس معاملے میں تمام مسلمانوں سے مختلف تھی“ بہت اہم اور قابل قدر سمجھتا ہوں اور وہ اس سبب سے کہ وہ غالب کے مجموعی نظریہ دین و مذہب کی کلیتہاً تائید کرتی ہے۔

یہاں تک غالب کے دینی اعتقادات پر بحث کرنے کے بعد انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عقاید سے متعلق غالب کے دوسوانحی احوال بھی پیش کر دیے جائیں۔ یہ دونوں واقعات یادگار غالب میں تفصیل سے درج ہیں۔ اور دینی و مذہبی اعتقادات کے بارے میں ان کے صلح مکمل یا غیر جانبدارانہ رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں پر ان کا خلاصہ تحریر کیا جا رہا ہے۔

اسے بہادر شاہ سخت بیمار تھے اور کسی طرح اتفاق نہ ہوتا تھا۔ مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے، لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے مہمان تھے۔ وہ اٹھارہ عشری تھے۔ ان کے ایمان پر بادشاہ کو خاک شفا دی گئی اور بادشاہ کو اس سے اتفاق ہوا۔ اب انھوں نے نذر مان رکھی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہوئی تو حضرت عباس کی درگاہ پر لکھنؤ میں علم چڑھاؤں گا۔ چوں کہ ان کا مقدر نہ تھا انھوں نے اس ضمن میں بادشاہ سے حد مانگی۔ بادشاہ نے روپیہ بھجوایا اور بڑی دھوم دھام سے لکھنؤ میں علم چڑھایا گیا۔ اس کے بعد دہلی میں یہ مشہور ہو گیا کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے جس کا انھیں بہت رنج ہوا۔ نتیجتاً اس کے تدارک کے لیے ساری دلی میں اشتہارات چسپاں کروائے گئے اور بادشاہ کے حکم سے اس امر کے اعلان کے لیے مرزا صاحب نے بھی ایک مشہور بنوان و بیخ الباطل لکھی جس میں بادشاہ کو تشیع کے الزام سے بری کیا گیا تھا۔ لکھنؤ کے مجتہد انصاری کے اعتراض پر مرزا صاحب کا جواب یہ تھا کہ بادشاہ کا ملازم ہوں۔ اس مشہور میں حکم و مضمون بادشاہ و حکیم الحسن اللہ خاں کا اور الفاظ میرے تصور کیے جائیں۔

مولانا فضل حق کو جو مرزا کے بہت گہرے دوست تھے وہابیوں سے سخت کد تھی۔ چنانچہ انھوں نے مرزا سے فرمایش کر کے اقتراح نظر یہ خاتم النہیین کے مسئلے پر مثنوی لکھوائی۔ اس مسئلے میں مولانا اسماعیل شہید کی یہ رائے تھی کہ خاتم النہیین کا مثل ممکن بالذات اور مستمع بالمرہ ہے۔ مستمع بالذات نہیں یعنی آنحضرت کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیہ کے منافی ہے نہ اس لیے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ برخلاف اس کے مولانا فضل حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النہیین کا مثل مستمع بالذات ہے اور جس طرح خدا اپنی مثل نہیں پیدا کر سکتا اسی طرح خاتم النہیین کا مثل بھی نہیں پیدا کر سکتا۔ یہ مشکل مرزا راضی ہو گئے لیکن مرزا نے مثنوی کو ان اشعار پر ختم کیا۔

ہر کجا ہنگام عالم بود

رحمت العالمین ہم بود

کثرت ابداع عالم خوب تر

یا بیک عالم دو خاتم خوب تر

در یکے عالم دو تا خاتم بکوئے

صد ہزاران عالم و خاتم بکوئے

فضل حق آخری شعر پر سخت چراغ پا ہوئے اور انھوں نے کہا اگر لاکھ عالم بھی خدا پیدا کر دے خاتم النہیین ایک ہی ہوگا۔ چنانچہ مرزا نے پہلے کچھ کچھ اشعار کے ساتھ کچھ اور اشعار بڑھا دیے اور مضمون کو اس طرح مربوط کر دیا۔

غالب ایں اندیشہ ہدیرم ہی

قرودہ ہم بر خویش می گیرم ہی

اے کہ ختم المصلحت خواندہ زی

دائم از روی تعلیم خواندہ ای

ایمن الف لائے کہ استغراق راست
نظم فائق معنی اطلاق راست

غشاء ایجاد ہر عالم کیلیست
گرد و صد عالم بود خاتم کیلیست

منفرد انحد کمال ذاتی است
لاجرم شش محال ذاتی است

زین عقیدت بر گردم والسلام
نامہ را در می نوردم والسلام

”ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلامت روی تھی... اجماعاً حاج سے کس قدر ان کا ذہن اہل کرتا تھا۔ اس طرح مرزا کی راست بیانی نے اس میزگی رائے کے تمام کل نکال دیے اور بغیر اس کے کہ مرزا کو وہابیوں کی حمایت منظور ہو جو ٹھیک بات تھی ان کے قلم سے آخر تک پڑی۔ پھر اس کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ جبراً لکھا ہے، وہ ان کے خیالات نہیں۔“

غرض یہ کہ ان کی شیعیت جو متداول اثنا عشری عقاید پر کھینٹ قائم نہیں صرف دو اہم پہلو رکھتی ہے۔ پہلا حب علیؑ اور دوسرا عقیدہ امامت کا۔ اس میں حب علیؑ کا پہلو ان کی ذات کا وجدانی پہلو ہے جو غالب کو بہ حیثیت علیہ الرضیٰ پیش کرتا ہے۔ دوسرا پہلو جو حب علیؑ کی تصویر ہی کا دوسرا رخ ہے ان کی ذات کا فکری پہلو ہے۔ ان کے عقاید کے یہ دونوں پہلو ان کے خیمہ ذات کی وہ مضبوط ختا ہیں جنہوں نے ان کو ناقابل بیان تمدنی طوفان کے باوجود سطح زمین پر استوار رکھا۔ اس عقیدے کا ہم ان کی خاک سے کس طرح چھوٹا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے عبدالصمد (ہرمزد) کے قیام نے یہ بیج چھوڑا

ہو یا بقول حالی کے تو اب حسام الدین حیدر خاں اور بخشی محمود رضا خاں کے خاندانوں سے یہ ہوتا پر وان چڑھا ہو کچھ ہی کسی لیکن اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اگر حسب طبع کی جڑیں ان کی ذات میں اتنی گہری نہ ہوتیں تو غالب جیسے مزاج کا آدمی صرف تھلک کی ڈیوڑھی پر جان نہ دیتا بلکہ منکر خدا ہو کر قصر ایمان ہی سے گرداں ہو جاتا۔

رسی ان کے صوفی ہونے کی بات تو اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ پھلے امیر خسرو، بیدل یا میر درد نہ کسی لیکن بیدل کے بعد فارسی شاعری میں اور ربیعہ میں ابتدائے شاعری سے آج تک حیات و کائنات، ہم و درہا، حسن و عشق، رنج و حسد، وحدت و کثرت، مکان و لامکان، فقا و ہما، سزا و جزا، خیر و شر، عبد و معبود، خواہش و تمنا، جنون و حکمت، فریاد کسی بھی عنوان پر اسنے بلند پایہ فکر انگیز و نایاب خیالات جتنے غالب کے کلام میں ملتے ہیں اور کہیں نہیں ملتے۔ مزید یہ کہ جہاں انھوں نے جمودی طور پر اپنے کلام میں اظہار و بیان کے کلیتہاً نئے سانچے پیش کیے وہاں تصوف جیسے گھمسنے پٹے روئے ہوئے اجڑے میدان میں اپنی عظیم انفرادیت اور بلندی فکر سے نئے گلزار کھلا دیے۔ ”انھوں نے تصوف کے رائج نظام کو سوال کی زد پر لا کر حقیقت اور سربست وحدت و کثرت سانپ اور رسی کے درمیان بھی ایک حقیقت کو ابھارا اور یہ سوال اٹھایا کہ کیا مشاہدہ کرنے والا بھی یعنی جسے شہود و شاہد و مشہود کا اور اک ہوتا ہے، اپنا ایک الگ وجود نہیں رکھتا... اور انھوں نے خواہش کو ایک Motive force یعنی محرک مان کر دیانت اور تصوف کے مروجہ تصورات کے خلاف اس کی کلیت میں قبول کر لیا۔ اور اس طرح اس کو زندگی کی ایک مثبت قدر قرار دیتے ہوئے اس کی تکنیک تکمیل رہنے کے وصف ہی کو اصل حیات قرار دیا۔“

دین و مذہب ان کے لیے سب سے بڑا قید خانہ تھا۔ چنانچہ اپنی ذات کے لیے انھوں نے اس کو یکسر مسترد کر دیا اور عذر یہ پیش کیا کہ میری فطرت عجیب ہے بھلا طریقت عربی کو کس طرح سمجھ سکتا ہوں۔

رموز دیں نہ شناسم درست و معذورم

نہاد من عجیب و طریق من عربی است

اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک واضح اشارہ اپنی کاٹھن تاریخ و ثقافت کا بھی دیا ہے جو حقیقت میں دین و مذہب کی دم گھونٹ دینے والی پابندیوں کے خلاف کسی رند مشرب مفکر و فنکار کا انتہائی معقول جواز ہو سکتی ہے۔ اور جس کو شیخ اکرام نے مفلوں کی ایک طرح کی حکین ازم Paganism کہا ہے۔ ان کی نظر میں دین و مذہب کے سارے تصورات خیر و شر کوئی قدر و قدر نہیں رکھتے۔ چنانچہ وہ یہاں تک دہل کہتے ہیں کہ ”میش اسروڈ“ کی خاطر اگر میرے بس میں ہو تو میں ریاض و رضوان بھی کھڑے کھڑے بازار میں بیچ دوں۔ سچ ”تمام مفلوں میں ایک طرح کی حکین ازم پائی جاتی ہے۔ وہ بیشتر میث اسروڈ کے قائل ہوتے ہیں۔“

ہلاک عشرتِ نقدم اگر زمن باشد

بچار سوائے فردثم ریاض و رضوان را

عاقبت کی ساری زندگی کا اگر آپ بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ وہ صرف جھٹکائے غزل ہی سے ہراساں و پریشان نہیں جھگی کعبہ نے سب سے بڑھ کر ان کا دم گھونٹ دیا ہے اور وہ کھلی فضا کی تلاش میں ”وسعت بت خانہ ہائے ہندو جیس“ کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

دل در کعبہ از جھگی گرفت، آوارہ خواہم

کہ پاسن وسعت بت خانہ ہائے ہندو جیس گوید

اور یہ تاثر ہمیں ان کی جھجھکیات ہی سے نہیں ان کی زندگی کے سارے رویے سے ملتا ہے۔ انسانی اقدار اعلیٰ کے سامنے دین و مذہب کی فردمانگی ان کی شاعری کا محبوب موضوع ہے اور اس کو انہوں نے طرح طرح سے ادا کیا ہے۔

دے و حرم آئینہ شکرار تمنا

دامادگی شوق تراشے ہے پتا ہیں

ہاسن میاویں اسے پدر فرزند آذر را نگر

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزدگان خوش نہ کرد

غرضیکہ دین بہ حیثیت مجموعی ایسا لباس نہ تھا کہ ان کی قیامت پر موزوں ہوتا۔
 رہے دینی اور مذہبی مخصوص اعتقادات تو ان کو بھی ان کی انفرادیت اپنی تکلیف میں قبول
 کرنے کی حتمی نہیں تھی۔ ان کو بھی وہ کات چھانت اور تراش تراش کے بعد قابل قبول
 بناتے تھے اس لیے کہ بہر حال انھیں اس ہی دنیا میں رہنا تھا جہاں اس قسم کی آلائشوں
 سے دامن بچنا ممکن نہ تھا۔ "خلاصہ یہ کہ مرزا صاحب ایسے صوفی تھے جو وحدت
 الوجود پر مکمل ایمان رکھتا ہو اور شراب بھی پیتا ہو۔ اور ایسے سنی تھے جو حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ
 کی خلافت کو حضرت علیؓ کا عطیہ مانتا ہو اور حضرت علیؓ کو ہر حیثیت سے افضل سمجھتا
 ہو۔ اس طرح وہ ایسے شیعہ تھے جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو خلیفہ بلا فصل نہ مانتا ہو۔ اس
 طرح درحقیقت وہ آزاد رو تھے اور تقلید کو شاعری کی طرح مذہب میں بھی روا نہیں رکھتے
 تھے اور اپنی روش عام سے ہٹ کر چلنے کی عادت کو مذہب میں بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔"

کتابیات و مقالات

- ۱۔ مقالہ - محمد امجد الحسنی مجلہ ملیا بان ۔ پشاور بچے دینی طالب نمبر ۱۹۶۹
- ۲۔ یادگار غالب ۔ معتمد الطائف حسین حالی ، نیکس بازار یافت ۱۹۹۴ء اور ذرا یادگار غالب کراچی ۔ ص ۳۷۔
- ۳۔ یادگار غالب ۔ ص ۳۸۔
- ۴۔ یادگار غالب ۔ ص ۵۳۔
- ۵۔ یادگار غالب ۔ ص ۲۶۔
- ۶۔ یادگار غالب ۔ ص ۵۰۔
- ۷۔ آثارِ غالب ۔ شیخ محمد اکرام چوٹوالی بنشن ۔ شیخ عزیز احمد مالک سب خانہ تاج آفس محل راولپنڈی ۔
- ۸۔ یادگار غالب ۔ معتمد الطائف حسین حالی ، نیکس بازار یافت ۱۹۹۴ء اور ذرا یادگار غالب کراچی ۔ ص ۷۴۔
- ۹۔ یادگار غالب ۔ ص ۷۶۔
- ۱۰۔ آثارِ غالب ۔ شیخ محمد اکرام چوٹوالی بنشن ۔ شیخ عزیز احمد مالک سب خانہ تاج آفس محل راولپنڈی ۔
- ص ۳۳۱
- ۱۱۔ ذکرِ غالب ۔ مالک رام نکتہ شعر و ادب سن آباد لاہور ص ۳۳۳ و ۳۳۴۔
- ۱۲۔ آثارِ غالب ۔ شیخ محمد اکرام چوٹوالی بنشن ۔ شیخ عزیز احمد مالک سب خانہ تاج آفس محل راولپنڈی ۔
- ۱۳۔ یادگار غالب ۔ معتمد الطائف حسین حالی ، نیکس بازار یافت ۱۹۹۴ء اور ذرا یادگار غالب کراچی ۔
- ۱۴۔ یادگار غالب ۔
- ۱۵۔ غالب کے منتخب فارسی مکتوبات ص ۲۷۔ مرتب و مستحکم پر توڑ پیلا ۲۰۰۹ء روحانی آرٹس پریس اسلام آباد۔
- ۱۶۔ مقالہ : میکیش اکبر آبادی ۔ مرزا غالب نمبر ۶۹ شاعر ۔ بہمنی
- ۱۷۔ ذکرِ غالب ۔ مالک رام نکتہ شعر و ادب سن آباد لاہور ص ۳۳۳، ۳۳۴

- ۱۸۔ یادگار غالب۔ مصنف: عبدالغنی حسن۔ مکتبہ ملی پڑ پڑت۔ ۱۹۹۲ء۔ ادارہ یادگار غالب کراچی۔ صفحہ ۱۰۰۔
- ۱۹۔ ذکر غالب۔ مالک و ام کلثوم مکتبہ شعر و ادب سن آباد۔ لاہور۔ ۱۹۹۹ء۔
- ۲۰۔ ذکر غالب۔
- ۲۱۔ غالب کے منتخب نثری مکتوبات میں ۲۱۷ء۔ مرتبہ و محترم پروفیسر ڈی۔ ڈی۔ ۲۰۰۹ء۔ دو جلدی آرٹ پریس اسلام آباد۔ میں ۲۱۷ء۔
- ۲۲۔ ذکر غالب۔ مالک و ام کلثوم مکتبہ شعر و ادب سن آباد۔ لاہور۔ ۱۹۹۸ء۔
- ۲۳۔ ذکر غالب۔
- ۲۴۔ غالب کے منتخب نثری مکتوبات میں ۲۱۷ء۔ مرتبہ و محترم پروفیسر ڈی۔ ڈی۔ ۲۰۰۹ء۔ دو جلدی آرٹ پریس اسلام آباد۔ میں ۲۱۷ء۔
- ۲۵۔ غالب کے منتخب نثری مکتوبات۔
- ۲۶۔ مقالہ: نیکش اکبر آبادی۔ مرزا غالب ایک سنی کی حیثیت سے۔ غالب نمبر ۳۹۔ شاعر بھٹی۔
- ۲۷۔ مقالہ: غالب اور قصیدہ۔ یوسف جمال انصاری۔ نقوش غالب نمبر III۔ فروری ۱۹۶۹ء۔
- ۲۸۔ شرح کشف المحجوب (مجلد)۔ تحقیق قزیر و شرح حامد الحق سیال پاشی صدیقی مطبوعہ المجلد ہاشمی۔
- ۲۹۔ یادگار غالب۔ مکتبہ پڑ پڑت۔ ۱۹۹۲ء۔ ادارہ یادگار غالب کراچی۔ صفحہ ۱۰۰۔
- ۳۰۔ آثار غالب۔ شیخ محمد اکرم چغتائی۔ شیخ ذریعہ امرا مالک کتب خانہ شیخ آفس محمد علی روز بھٹی۔
- ۳۱۔ یادگار غالب۔ مکتبہ پڑ پڑت۔ ۱۹۹۲ء۔ ادارہ یادگار غالب کراچی۔
- ۳۲۔ مقالہ: (ڈاکٹر ذریعہ)۔ غالب نامہ دلی۔ جولائی ۱۹۶۹ء۔
- ۳۳۔ آثار غالب۔ شیخ محمد اکرم چغتائی۔ شیخ ذریعہ امرا مالک کتب خانہ شیخ آفس محمد علی روز بھٹی۔
- ۳۴۔ مقالہ: نیکش اکبر آبادی۔ مرزا غالب ایک سنی کی حیثیت سے۔ غالب نمبر ۳۹۔ شاعر بھٹی۔

والہ حیدر آبادی اور شرح اشعار غالب

غالب کا انتقال پندرہ فروری ۱۸۶۹ء مطابق دوسری ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہوا۔ جب کہ مولانا مولوی شیخ عبدالعلی المتخلص بہ والہ حیدر آبادی کا انتقال ۱۳۱۱ھ میں ہوا۔ یعنی ان دونوں حضرات کی وفات میں صرف چھتیس سال کا فاصلہ ہے۔ اس لحاظ سے اگر شارح موصوف کی اپنی عمر، وفات کے وقت پچاس سال بھی رہی ہو تو وہ غالب کے ہم عمر نہ کسی ہم عصر ضرور تھے۔ چنانچہ اس قربت زمانی نے کہ شارح اور شاعر کے درمیان تھی مجھے مجبور کیا کہ ان کی اردو کلام کی شرح موسوم ”ذوقِ سراحت“ کو جو ان کی موت کے بعد ۱۳۱۳ھ میں چھپ کر تیار ہوئی، غور سے پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ غالب کے اردو کلام کے مطالب ان کی صحنِ حیات اور موت کے اوائل میں اس دور کے خواندہ طبقے میں کیا تھے۔ یہ خیال مجھے اس مسئلہ حقیقت کے پیش نظر آیا کہ فاصلہ چاہے وہ زمانی ہو یا مکانی اشیاء ہی کو نہیں خیالات اور تصورات کے ہیولوں کو بھی ذہنِ دانا دیتا ہے۔ اس لحاظ سے مولوی احمد حسن شوکت کی شرح کو بھی جو ۱۳۳۷ھ میں چھپی وہ فضیلت حاصل نہیں کہ جو ”ذوقِ سراحت“ کو ہے کہ والہ حیدر آبادی کی یہ شرح احمد حسن شوکت کی شرح سے چوبیس سال پہلے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی تھی۔ اس پس منظر میں احمد حسن شوکت کا یہ دھڑکنے والا ”از روئے کہ غالب جان پہ جاندار سپردِ تادورِ ہمسین“ ما کسے پاورِ شعلہ زار جل سواست نہاد“ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ”ذوقِ سراحت“ کا مکرر اختیار ہی یہ ہے کہ یہ غالب کے اردو کلام کی وہ شرح ہے جو ان کی شرحوں میں سب سے پہلے شائع

ہوئی اور جس کے شارح غائب کے معاصرین میں سے تھے۔ یہی اس شرح کی سب سے بڑی فضیلت ہے۔

”وثوق صراحت“ (۱۹۲) ایک سو پانچ صفحات پر مبنی ہے۔ اس کا دو صفحے کا دیباچہ والدِ حیدر آبادی کے بیٹے محمد عبدالواحد نے لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ”اس خاکسار کے والد مرحوم جب نظام کالج میں بی۔ اے کلاس کو اردو دیوان مرزا غائب دہلوی پڑھاتے تھے تو اس کے ان مقامات پر جن کو شرح طلب جانتے تھے اور ایسی مشکلات پر جن کو حل کے قابل سمجھتے تھے شرح اور حل لکھ دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نظر ثانی کے بعد نواب عبدالملک بہادر نظام تعلیمات کو اس کی شرح پیش کریں لیکن ان کا یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ اگرچہ اس شرح پر نظر ثانی نہیں کی گئی لیکن نظر اول ہی میں جو کچھ لکھا ہے نہایت نفیس اور قابلِ قدر ہے۔ کیوں کہ ایک فرد کامل، سخن گو، سخن دان، سخن فہم اور مسلم الثبوت استاد کی تصنیف ہے۔ اختصار کے ساتھ دقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مقصود قائل فوت نہ ہو۔ کہیں فوراً کہیں کچھ قوض (خوض، پہ سبب حیدر آبادی ہونے کے باوجود لکھا ہے) و قائل سے طالب علم کے ذہن نشین ہو جائے۔ حضرت مرحوم کی یہ عادت تھی کہ شرح کو بلا ضرورت ہرگز طول نہ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ شرح مختصر مفید ہونی چاہیے۔“

”اب مجھ کو جو مرحوم کے دیوان اور انشاء کے چھپوانے سے فرصت ملی تو اس شرح کو بھی ساف لکھ کر اور اس کا تاریخی نام وثوق صراحت رکھ کر بغرض افادہ چھپوایا۔ امید ہے کہ مقبول خاص و عام ہوگی۔“

الراقم

محمد عبدالواحد عفی عنہ

مندرجہ بالا سطور سے ہی قاری پر یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ غائب کے کلام کی مکمل شرح نہیں بلکہ کہیں کہیں جہاں شارح نے ضرورت محسوس کی ہے وہاں ضروری معنی یا مطلب لکھ دیے ہیں۔ کہیں سرسری اشارے دے دیے ہیں اور کہیں غائب کے کلام کی صحیح بھی کر دی ہے۔ چنانچہ غائب کے اردو دیوان کی پہلی غزل ”نقش فریادی ہے رنج“

کے جس کے متداول دو اوین میں پانچ اشعار ہیں، صرف دو اشعار پر معمولی سا نوٹ ہے اور دونوں جگہ مندرجہ ذیل طریقے پر استعمال شدہ الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں۔

۱۔ جبرائیل کاغذی: فریادیں کا لباس جو قدیم میں دستور تھا۔ یہ کتاب ہے مجروح ہے چارگی و ظلم و ذاری سے۔

۲۔ (جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے) شوق: شوق عاشق جو شائقِ قتل ہے۔

اسی طرح غالب کے مندرجہ ذیل شعر پر یہ عبارت لکھی ہے:

کمرے ہے ہادہ ترے لب سے کسب رنگِ فردخ

خطِ خیالہ سراسر لگاؤ گل جیس ہے

”لب کی جگہ رخ بہتر ہے کیوں کہ تشبیہ گل کی لب سے مسوم نہیں“

لیکن ان سارے امور کے باوجود اس شرح میں بہت سے ایسے مطالب اور خیالات ہیں جو شروع متداول سے یکسر مختلف ہیں۔ ان میں سے چند ایسے ہیں کہ ان سے اتفاق کرنا طبیعت پر گراں معلوم ہوتا ہے لیکن چند ایسے ہیں کہ تسلیم شدہ خیالات پر بہت گراں قدر اضافہ ہیں۔ اور تمام امور کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے خیال کیا کہ سنجیدہ غالب شناسوں کے لیے ان تنازعہ فیہ اشعار کے مطالب کا بیان اس ضمن میں ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ خاص طور پر ایسے وقت پر کہ ان کی پیدائش کی دو سو سالہ سالگرہ کے زمرے تاحال فضاؤں میں گونج رہے ہیں۔

۱۔ دلم نے داد نہ دی تھگی دل کی یارب

حیر بھی سینہ کھل سے پڑ افشاں نکلا

غالب نے خود بھی اپنے اس شعر کی تفسیر کی ہے اور کہا ہے ”دلم حیر کی تو جین پہ سب ایک رخصت ہونے کے اور نکوار کے دلم کی تحسین پہ سب ایک طاق سا کھل جانے کے ہوتی ہے۔ حیر تھگی دل کی داد کیا دیتا وہ تو تھگی دل سے گھبرا کر پڑ افشاں اور سرا سیمہ نکھ گیا۔“ غالب کے مستند شارحین نے اس شعر کی شرح اسی طرح غالب کے اشعار میں کی ہے۔ اور مسلک مطالب سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شعر میں لہری ساری عبارت تھگی دل پر اضافی معنی

ہے لیکن والدہ نے اس ذیل میں ان مطالب کو بڑا خوب صورت رنگ دیا ہے۔ انھوں نے عجبی دل کی تشریح اس طرح کی ہے ”عجبی دل جو تمنا ہے تیر میں تھی“ کو کیا یہ عجبی دل ہی تھی اس حیر کے لیے اور چوں کہ اس کی خدمت ناقابل برداشت تھی اس لیے تیر بھی سرا سیدہ و پر فصیح باہر نکل گیا۔ آپ محسوس کریں گے محبوب کے حیر کے دل سے آ رہا ہو جانے کے خیال کا عجبی دل سے رشتہ جوڑ کر غالب نے کیا خوب صورت عمارت بلند کی ہے اور شارح نے اس عجبی دل کو حیر سے وابستہ کر کے اس کو مزید کس قدر دل آویز بنا دیا ہے۔

۲۔ ہے نو آموز فتا ہست دشوار پند

سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

والدہ نے اس شعر کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے ”یعنی اپنی ہمت دشوار پند ہے با آنکہ نو آموز فتا ہے آسانی سے مرحلہ فتا کو طے کیا۔ یہ کام آسانی سے سرانجام پانا بڑی مشکل بات ہے کہ ہر ایک سے ہو نہیں سکتا۔“ ان مطالب میں یہ جملہ کہ یہ کام مشکل سے شروع ہوتا اور ہر ایک سے ہو نہیں سکتا پر ختم ہوتا ہے ”خدا اول شروع اور مسئلہ مطالب کے خلاف ہے۔ اس کے مسئلہ مطالب یہ ہیں کہ فتا جیسی منزل تو میں نے ابتداءے عشق ہی میں حاصل کر لی۔ اب اپنی طبع دشوار پند کے لیے کون سا مرحلہ تلاش کروں، سخت مشکل میں ہوں۔“

۳۔ کاوش کا دل کرے ہے نکاحا کہ ہے جنور

ناخن پہ قرض اس گروہ نیم باز کا

اس شعر کے ضمن میں والدہ نے صرف اس قدر لکھا ہے ”گروہ میں در باندہ بننے کی وجہ سے فقط قرض مناسب گروہ ہے۔“ مجھے یہ خوب صورت اشارہ تمام موجودہ شرحوں پر ایک اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کی تشریح پر دفیئر یوسف سلیم چشتی نے نہایت مناسب کی ہے لیکن وہ بھی اتنا کہہ کر رک گئے ہیں۔ گروہ نیم باز کنایہ ہے دل سے۔ دل کو گروہ اس لیے قرار دیا کہ عجبی یا فرط غم سے دل گروہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ”یہ تصور کا صرف ایک رخ ہے اور وہ بھی کنایہ کا حیر دنی رخ۔ اس کا معنوی رخ وہ ہے جو والدہ نے بتایا ہے۔ چنانچہ یہ دل

کہ کاوشِ ناخن کا لذت چشیدہ ہے، ناخن سے بھر کاوش کا تقاضا کر رہا ہے کہ یہ ناخن پر یہ حیثیت ناخن ہونے کے قرض ہے۔ اب تقاضا اور قرض کے ملازمت کے علاوہ خوب صورتی کتنا ہے کی یہ ہے کہ گرہ میں زر ہوتا ہے۔ ناخن نے اس کو آدھا کھول کر یا کر کے کر چھوڑ دیا۔ اب عشق کی اذیت پسندی تقاضا کر رہی ہے کہ اسے ناخن اس گرہ زر کو پورا کھول۔ اس عمل سے جہاں عاشق کی اذیت پسندی کو تسکین ملے گی وہاں لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ یہ دل نہیں کاٹن زر ہے اور اس کو جس قدر کر دیا جائے گا اتنا ہی اس سے سونا برآمد ہو گا۔ سو اس میں خود ستائی کا بھی ایک واضح پہلو ہے جو غالب کی شاعری کا بڑا اہم عنصر ہے۔

۴۔ گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں قریب

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں صخر کھلا

اس شعر کے مطالب میں والد نے صرف اس قدر لکھا ہے "دشنہ = کلائی۔ نشتر = فصد دیوانہ کے لیے ہے۔"

شعر کے مطلب میں کسی قسم کا افکار نہیں لیکن والد نے دشنہ کے لیے کلائی لکھ کر صاف بات کو الجھلک کر دیا ہے۔ دشنہ کلائی کا کنا یہ تو ہو سکتا ہے لیکن یہاں وہ بھی نہیں ورنہ شعر بے معنی ہو جائے گا۔ نہ معلوم موصوف کے ذہن میں اس شعر کے کیا مطالب تھے۔

۵۔ شبیوں اندھیری ہے شب غم، ہے بلاؤں کا نزول

آج ادھر ہی کو رہے گا دیدارِ اختر کھلا

اس شعر کے مطالب میں والد نے صرف اس قدر لکھا ہے۔

"اختر = طالع بد" لفظ اختر کے یہ معنی محل نظر ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ بظاہر ہرے شعر میں اس کا کوئی قرینہ نظر نہیں آتا۔ تمام حواہل، شروح کو مد نظر رکھیں تب بھی اختر کے معنی ستارے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ چنانچہ "طالع بد" والی بات بھری غم سے بعید ہے۔ ہو سکتا ہے والد نے اس کے معنی کتنا بتا لیے ہوں۔ اس لیے کہ ستارے بھی آج "ادھر" کو دیکھ رہے ہیں اور اس لیے ساری روشنی اس طرف ہے اور شب غم اندھیری ہے

اور بلاؤں کا نزول ہو رہا ہے۔ اگرچہ یہاں اس کا محل نہیں لیکن چلتے چلتے لفظ ”ادھر“ کے بارے میں بھی دو باتیں ہو جائیں۔ اکثر شاعرین نے اس لفظ کو ادھر بمعنی آں جایا آن طرف تصور کر کے اس کی شرح کی ہے اور سب یہ کہتے ہیں کہ ستارے اُس طرف اس لیے دیکھ رہے ہیں کہ آسمان سے بلاؤں کا نزول ہو رہا۔ جن کے اترنے کا تشاؤ دیکھنے کی غرض سے ستاروں کا رخ زمین سے آسمان کی جانب پھر گیا ہے (حسرت موہانی و مولانا نعیم جب کہ صرف آ سی لکھنوی اس کو ادھر یعنی اُس طرف پڑھنے پر مصر ہیں اور کہتے ہیں کہ مصنف اعتراض کرتا ہے کہ شب غم اس قدر تاریک کیوں ہے حالانکہ آج بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور دیدہ اختر نحوست بھی (والہ کے ساتھ ان کا ”طالع بد“ کے معنی میں اشتراک ہے) ادھر ہی کو نکلا رہے گا۔ جس سے تاریک نہ ہونا چاہیے۔ کیوں ازراہ اعتراض ہے کہ طریق سوال۔ ”اگرچہ میں آ سی لکھنوی کی بات پر رے طور پر سمجھ نہیں سکا۔ پھر بھی میں نے آپ کو مجملہ لفظ ادھر کا متبادل شروع کا برتاؤ دیا۔ میری اپنی نظر میں اس شعر مطلب صرف اس وقت صاف ہوتا ہے جب قاری اس شعر کے مفروضات تک پہنچ سکے۔ اگرچہ یہ مفروضات بہت ہی سامنے کے ہیں اور ان میں تحقیق و تدقیق کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اب شعر پڑھیے۔ شاعر کی شب غم کب ہوتی ہے۔ جواب ہے جب اس محبوب اس کے پاس نہیں ہوتا۔ اس شب غم میں تاریکی تو ہوتی ہی ہے لیکن اس میں شدت کب ہوتی ہے۔ جواب ہے جب محبوب رقیب کے پہلو میں ہوتا ہے۔ سو یہ ستارے رقیب کے پہلو میں محبوب کو دیکھنے میں لگے ہوئے ہیں اور ظاہر ہے یہ موقع بھی ایسا ہی ہے کہ ساری ”روشنی“ ادھر ہی ہو۔ ایسے حالات میں شاعر کی رات بھی اندھیری ہوگی اور اس میں بلاؤں کا نزول بھی ہوگا اور رقیب کی کامیابی اور کامرانی پر ستاروں کی آنکھیں بھی ادھر ہی ہوں گی۔ میری دانست میں اس شعر کا یہی صحیح مطلب ہے۔

۶۔ پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن

دست مرہون تھا، رشمار رہن غارہ تھا

اس شعر کے ضمن میں والہ نے ”رسوائی انداز استغنائے حسن“ کے سامنے یہ لکھا ہے

رسوائی عاشق ہاں سلتائے معشوق حنا اور غازہ کے سبب کہ ان دونوں کو بوسہ دے نہیں
 سکتے بلحاظ بگڑنے رنگ کے "یہ مطالب سنے ہی نہیں انوکھے بھی ہیں۔ والد نے یہ رسوائی
 بظاہر عاشق کے سر ڈالی ہے جو ہاتھ کا یا رخسار کا بوسہ لے کر اس لیے رسوا ہو گا کہ حنا اور
 غازہ کے رنگ خراب ہو جائے گا۔ یہ مطالب دور از کار ہی نہیں شعر کے تمام قرائین کے
 خلاف ہیں۔ شعر میں تو رسوائی انداز استغنائے حسن کی ہے اس میں بیچارہ عاشق کہاں
 آگیا۔ دوسرے بوسہ کی وجہ سے غازہ اور حنا کے رنگ کا خراب ہونا بھی دور از کار ہے
 اور پھر عاشق کی رسوائی کا اس میں در آنا انتہائی بے معنی بات ہے۔ غرض یہ کہ یہ معنی آج
 تک کسی اور شرح میں میری نظر سے نہیں گزرے۔

۷۔ ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا حرا کیا

اس شعر کے مطالب اس طرح لکھے ہیں "مرنا۔ فدا ہونا۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا حرا کیا۔
 لدا ہونا یا رہ کر مر جائیں تو ہوس کی بازیوں سے رہائی ہو۔ اس وقت زندگی کا شرہ پایا۔"
 یوں تو شعر کے مطالب میں کوئی اشکال نہیں لیکن والد نے مرنا سے فدا ہونا یا عاشق
 ہونا مطلب لکھ کر اس شعر کو اور بھی نکھار دیا ہے۔ اگرچہ اس کے آگے جو کچھ تخریج کی گئی
 ہے وہ چنداں جالب نظر نہیں۔

۸۔ تمنائے زباں مھ سپاس بے زبانی ہے

مٹا جس سے نقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

اس شعر کے مطالب میں بظاہر کوئی اشکال نہیں۔ سب شارح اس کے مطالب پر متفق
 نظر آتے ہیں لیکن والد نے "بے دست و پائی" کو اپنے لغوی معنی میں لے کر ایک عجیب
 رد انوکھی تخریج کی ہے کہتے ہیں "ہماری بے دست و پائی مقتضی حماسی تشریف آوری کی
 تھی۔ بارے ہماری بے زبانی نے یہ شکوہ بھی کرنے نہ دیا۔ اور بے زبانی کی سپاس گزاری
 ماری تمنائی زبان ہے۔" دوسرے تمام شارحین نے بے دست و پائی کو بے چارگی اور
 اجزی کے معنی میں لیا ہے۔

۹۔ وہاں ہر بہت پیارا جو زنجیر رسوائی

عدم تک ہے وفا چاہے تیری ہے وفا کی کا

یوں تو خیال اور مضمون کے لحاظ سے یہ شعر غالب کی فضولیات میں آتا ہے لیکن والدہ نے اس شعر کی وضاحت بڑے اچھے طریقے سے کی ہے۔ کہتے ہیں ”حلقہ وہاں ہر بہت طعنہ جو کا باہم مل کے زنجیر رسوائی ہو گیا۔ اس مصرع کے موافق ”حلقہ ہر حلقہ چواقد وہاں زنجیر است“ فارسی کے اس معروف مصرعے نے شاعر کے مضمون میں بھی جان ڈال دی ہے۔

۱۰۔ گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط

شعلہ خس میں جیسے غوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

تقریباً تمام شارحین نے نگاہ گرم سے نگاہ عتاب مطلب لیا ہے لیکن والدہ نے نگاہ گرم کے معنی نظر مہر لکھے ہیں۔ جو گرم اور شعلہ کی رعایتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے مناسب نہیں معلوم ہوتے۔

۱۱۔ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

ہندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

اس شعر کی شرح حالی کی جڑی میں سب شارحین نے یہ کی ہے ”میری ہندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھے سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں ہندگی سے مراد عبادت (پرستش) نہیں ہے بلکہ (عبودیت) بندہ ہوتا ہے۔ ہندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل جی بات ہے“ مندرجہ بالا شرح کے خلاف والدہ نے ہندگی سے مراد صنم کی ہندگی لی ہے اور لکھا ہے کہ ”صنم کی ہندگی میں اپنی بھلائی جو نہ ہوئی گویا صنم کی صاحبی نمرود کی خدائی تھی جس سے پرستاروں کا بھلا نہ ہوا۔“

۱۲۔ یک الف بیش نہیں میتقل آئینہ جنوز

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریاں سبھا

اس شعر کی شرح والدہ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے ”میتقل سے جو خط آئیے پر

پڑتا ہے وہ ہو ہو الف کے مانند ہوتا ہے تو محض مذکور ابھی الف ہی کی مشق کر رہا ہے۔ هنوز روزِ اول ہے۔ مگر چاک گریبان اپنا کہ وہ بھی بصورتِ الف تھا سیکڑوں شکلیں اس کی بدل گئیں تو معلوم ہوا کہ مشق گریبان وری میں آئینہ بہت دی ہے۔ اور حضرت غالب کا گریبان مٹھی۔ "ظاہر ہے کہ اردو نے معنی میں غالب کی شرح کی موجودگی میں والد کی شرح باطل ہے۔ غالب کی شرح میں آئینہ اپنے دل ہی کا کنایہ ہے۔ یہ کوئی فریقِ مقابل نہیں۔

۱۳۔ سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحتِ ظلی

ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

مندرجہ بالا شعر کے پہلے مصرعے کے تین الفاظ کے نیچے ۲، ۱ اور ۳ لکھ کر دوسرے مصرعے کے تین الفاظ کے نیچے بھی اسی طرح ۳، ۲، ۱ لکھ دیا گیا ہے اور نیچے اشارے کے طور پر والد نے صرف دو الفاظ لکھ دیے ہیں۔ لف و نشرِ مرج۔ اب آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ سفرِ عشق کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں قدم، ضعف کی مناسبت سے سایہ اور راحتِ ظلی کی مناسبت سے شبستاں ہے۔ مجھے یقین ہے کسی شارح کی غالب کے اس شعر میں اس خوب صورت صنعتِ رعایتِ لفظی کی طرف نظر نہیں گئی ہے۔

۱۴۔ بجلی اک کوئٹہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لبِ سمیۂ تقریر بھی تھا

اس شعر کے اشارے بڑے دلچسپ اور انوکھے ہیں۔ "بجلی = یہ کنایہ چمک سے واحوں کی ہے بات کرنے میں۔ بجلی کو ہارن لازم ہے۔ ہارن تراوشِ تقریر کو قرار دیا ہے۔ جو چارۂ لب ^{لفظی} ہے۔" ظاہر ہے کہ غالب کے شعر کی یہ بالکل نئی تشریح ہے۔

۱۵۔ شوق ہے سماں طرازِ تازشِ اربابِ عمر

ذره صحرا و جنگاہ و قطرہ دریا آشنا

یہ تو اس شعر کے معنی والد نے بھی دی کیے ہیں جو اکثر شارحین نے بیان کیے ہیں۔ لیکن اس میں تشریح کا آخری جملہ کہ جو رعایتِ لفظی کی طرف توجہ دلاتا ہے خاص

طور پر دلچسپ ہے۔ "لفظ آشنا ضد بیگانہ و بمعنی شناسا کثرتہ ایہا می و لفظ و مناسب دریا ہے۔" شعر کے اس پہلو پر شاید کسی شارح کی نظر نہ گئی ہو۔

۱۶۔ جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعف و ماغ

سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست

اپنے مضمون اور خیال کے لحاظ سے یہ شعر بھی فضولیات غالب میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ تمام شارحین نے اس کا وہی مطلب بتایا ہے کہ جو اس کے الفاظ سے ظاہر نکلا ہے۔ لیکن والد نے یہ کہہ کر عنبر مضعف و ماغ ہے ظاہر خیال کے دو بے ربط ٹکڑوں میں ربط پیدا کر دیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے ضعف و ماغ کی بات عنبر کی اس ہی خصوصیت کی بنا پر کی ہوگی کہ یہ باتیں اس زمانے کے محاسن شعر میں شمار ہوتی تھیں۔

۱۷۔ لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر

میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

شعر کا مسلہ مطلب تو یہی ہے کہ میرا وجود بذات خود انتہائی ناپائیدار ہے کہ نوک خار پر ایک قطرہ شبنم ہوں اور خود بخود فنا ہو جاؤں گا بھلا مجھ کو مٹانے کے لیے مہر درخشاں کیوں زحمت کر رہا ہے۔ اس مضمون میں بھی غالب نے لفظ لرزتا لا کر اپنی غالیبت ثابت کی ہے اور وہ اس طرح کہ بوقت طلوع سورج بھی لرزتا اور نوک خار پر قطرہ شبنم بھی لرزتا نظر آتا ہے۔ قطع نظر ان مطالب کے اب والد کی تشریح پر ہمیں تو احساس ہوگا کہ انہوں نے وہ بات کہی ہے جو قابل قبول نظر آتی ہے کہتے ہیں۔ "فکر عقلی دست مہر سے جو میرے لینے میں محصور ہے میرا دل لرزتا ہے کیوں کہ شبنم کو نوک خار سے لینا غلط دست رنجش سے خالی نہ ہوگا۔"

۱۸۔ لاف حنکیں فریب سادہ ولی

ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداور

والد نے اس شعر کی شرح اس طرح کی ہے "ایسے دل گداز اسرار عاشقی کا میں راز دار ہوں کہ سامع ان کو سن کر اگر لاف مہر و قہر مارے، لاف زنی اس کی فریب ناوائی

سے ہوگی۔ "یہ مطالب تمام سرودہ شرحوں کے خلاف ہیں اور بظاہر اس شعر کے قرائن سے سامع کسی طرح مضمون کا سراغ نہیں پاتا۔

۱۹۔ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

کون جیتا ہے تری ذلف کے سر ہونے تک

اس شعر کے نیچے وآلہ نے صرف سر ہونے کے معنی "رہا ہونے یعنی دراز ہونے تک" لکھے ہیں۔ مزید کسی قسم کی کوئی تشریح نہیں۔ یہ معنی مجھے کسی لغت یا شرح میں نظر نہیں آتے اور بظاہر کل نظر ہیں۔

۲۰۔ آزاد کی نسیم مبارک کہ ہر طرف

ٹوٹے پڑے ہیں حلقہ دام ہوائے گل

اس شعر کی صوری خصوصیات میں تو نسیم، گل اور ہوا کی رعایت کے علاوہ آزادی اور حلقہ دام اور ٹوٹے پڑے ہیں کا تضاد بھی قابل توجہ ہے۔ اور میری رائے میں ٹوٹے پڑے ہیں بطور اظہار کثرت محاورہ استعمال ہوا ہے۔ سو مطلب اس شعر کا صرف اس قدر ہے کہ شے کھل گئی ہے اور خوشبو آزاد ہو گئی ہے۔ نسیم کو یہ آزادی مبارک ہو۔ اب ان مسئلہ مطلب سے قطع نظر وآلہ نے اس شعر کے ضمن میں جو اشارہ دیا ہے وہ یہ ہے "ٹوٹے پڑے ہیں۔ فصل خزاں میں" جو موجود سیاق و سباق میں قابل فہم نہیں۔

۲۱۔ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس شعر کے مطالب میں وآلہ نے صرف اس قدر لکھا ہے "یعنی وہ لکھیں گے کہ مطلب خط معلوم نہ ہوا تو یہی کون ہے۔" اس اشارے سے اس دور کا طرز فکر اور ساوہ لونی کا اظہار ہوتا ہے۔

۲۲۔ حسد سے دل اگر اندر وہ ہے گرم تماشا ہو

کہ چشم تنگ شاید کثرت نگار سے دا ہو

آلہ نے اس شعر کے نیچے یہ اشارہ دیا ہے۔ "خطاب پڑا ہوا جو خورویوں کو دیکھ نہ

ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انہوں نے اس شعر کی وسعت کو بہت محدود کر دیا ہے۔

۲۳۔ طاعت میں تار ہے نہ سے دانگن کی لاگ

دوزخ میں ڈال دے کوئی نے کر بہشت کو

والہ نے اس شعر کے ضمن میں یہ لکھا ہے۔ ”لاگ، خلاف، دوزخ میں بہشت کو ڈال دوتا کہ سے اور انگن کی لاگ نہ رہے کیوں کہ سے آتش دیدہ ہے اور جوئے عمل جنت آتش دیدہ نہیں ہے۔ جب یہ بھی آتش دیدہ ہو جائے تو دونوں مساوی ہو جائیں گے۔“
 بظاہر یہ شرح مروجہ مطالب و سلسلہ معافی کے خلاف ہی نہیں عجیب بھی ہے لیکن اس میں ایک لفظ لاگ کے معنی درست معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے اردو کے جتنے لغت دیکھے بشمولیت شان الحق حقی کے تازہ ترین لغت فرہنگ مکتظ کے سب میں اس لفظ کے معنی عداوت، رنجش، مخالفت ہی نظر آئے۔ لیکن حیرت ہے غالب نے یہاں یہ لفظ نسبت، تعلق اور لگاؤ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جب کہ اس کے سلسلہ معنی میں خود ان ہی کا شعر ہے۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ

جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

پور اس شعر میں لاگ اور لگاؤ چوں کہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لیے دونوں کے معنی کا فرق بھی ظاہر ہو گیا ہے۔

۲۴۔ اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقی ستم تو دیکھ

آئینہ تاکہ دیدہء فحیر سے نہ ہو

چند مستثنیات کے علاوہ اس شعر کا مطلب اکثر شارحین نے یہی لکھا ہے کہ وہ اس قدر ستم آئین ہے کہ اپنی صورت بھی دیدہء فحیر کے علاوہ کسی دوسرے آئینے میں نہیں دیکھتا۔ عام آدمی کے لیے یہ مضمون کوئی خاص چیز نہیں ہے بلکہ شاذ و نادر ہی کوئی شخص اس مضمون کو صحیح طور پر سمجھ پائے گا جب تک کہ اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ غریب کی آنکھ میں موت کے بعد آئینے کی سی کیفیت بیدار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تمام شارحین کی اس کی کو والہ

نے اس طرح پورا کر دیا ہے۔ ”جب تک چشم قربانی سے آئینہ نہ ہو اپنی صورت کو دیکھنا نہیں۔ لطف یہ کہ چشم مذہبوح میں ذابح کی صورت آئینے کی مانند نقش پذیر ہوتی ہے۔“

۲۵۔ بچتے قصیں مواخذہ روز حشر سے

قائل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

یوں تو مرہبہ شرحوں میں اس شعر کے مطالب میں تمہوزا بہت فرق ہے۔ لیکن والد نے تمام شرحوں کے خلاف بالکل ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے۔ کہتے ہیں ”بچتے قصیں: ہم۔ تم گواہ ہو یعنی تم ایسی گواہی دو گے کہ قائل بیخ جائے گا اور محتول گرفتار ہو جائے گا۔“

۲۶۔ بیداد وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر

ہر چند مری جان کو تھا رابطہ لیوں سے

والد نے اس شعر کی تشریح اس طرح کی ہے۔ ”عہد وفا نے جو مستحق کے ساتھ تھا جان برلپ رسیدہ کے رابطہ کو لیوں کے ساتھ رہنے نہ دیا اور پاس عہد میں جان جاتی رہی۔“ والد کی تشریح میں پاس عہد وہ نیا عنصر ہے جو انھوں نے اس کے مطالب میں داخل کیا ہے جو کسی دوسرے شارح کے ہاں نہیں۔ سب نے جان جانے کا سبب بیداد بتایا ہے۔

۲۷۔ بس بھوم تا امید ی خاک میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت ہماری سخی ہے حاصل میں ہے

والد نے اس شعر کے تحت صرف سخی ہے حاصل کے معنی لکھے ہیں اور وہ یہ ہیں: ”وہ سخی جو حصول مدعا کی توقع پر کی جاتی ہے۔“ ع تا لفظ سرنگریاں ہے اسے کیا کہیے۔

۲۸۔ تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے

حوران غلد میں تری صورت اگر ملے

تسلیم شدہ مطالب کے خلاف والد نے اس کے یہ مطالب بیان کیے ہیں۔ ”شاید تیری صورت حوران جنت میں ملے اور اس ملنے سے حزن نظر باری کا حاصل ہو مگر ہم تجھے نہ دیکھیں تو تسکین کا کیا ماتم نہ کریں گے۔“

۲۹۔ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب

آخر تو کیا ہے اسے نہیں ہے

اس کے مطالب میں شاعرین میں چھٹا اختلاف نہیں۔ والد نے اس شعر کا کوئی تفصیلی اشارہ بھی نہیں دیا صرف لفظ "اے" کے معنی "اگر" لکھے ہیں جو مجھے اردو فارسی مرئی کسی لغت میں نہیں ملے۔

۳۰۔ بہت دنوں میں تھناں نے تیرے پیدا کی

وہ اک نگہ کر بظاہر نگاہ سے کم ہے

اس شعر کے معنی میں والد نے بہت دنوں کے معنی بہت دنوں کی مشق کے لیے ہیں جو دوسری شرحوں پر اضافہ معلوم ہوتا ہے۔

۳۱۔ کبھی تو اس دل خودیہ کی بھی داو ملے

کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے

اکثر شاعرین نے صرف کچھ پر آرام کرنے کی حسرت کا بیان کیا ہے لیکن والد نے اس پر ہم بالیں وہم بہتری کا ان الفاظ میں اضافہ کیا ہے۔ "کبھی تو اس دیوانے کو اپنا ہم بالیں وہم بہتر کچھ کہ ایک مدت سے حسرت پرست اس کا ہے۔"

۳۲۔ وفا حائل و دھوئی عشق بے بنیاد

جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

اکثر شاعرین اس شعر پر متفق ہیں لیکن والد نے ایک عجیب تخریج کی ہے جو خاصی انوکھی اور الجھک ہے۔ کہتے ہیں "وفا نہ نظر و رو برو عاشق صادق کے اور پائیں وہ اس کی عاشقی کا دھوئی بے بنیاد۔ کیوں کہ وفائے عاشق صادق پاک دامن مانع ہوا وہ اس ہے اور جنون عشق عاشق بوالہوس کا ساختہ ہے۔ فصل گل میں یا بہار حسن معشوقی میں حلالاں کہ فصل نہ کوہ میں جنون ساختہ محال عادی ہے۔ پس یہ عجیب معاملہ ہے۔ یہ شعر مرزا صاحب کے پایہ بلاغت سے گرے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ بالکل ان میں تعقید معنوی ہے۔" جہاں سوچے اب کسے دہشا کرے کوئی۔

۳۳۔ سوزش باطن کے ہیں اسباب منکر و نہ یاں

دل صید گر یہ د لب آشنائے خندہ ہے

اس شعر کا مطلب صرف یہ ہے کہ لوگ میری سوزش باطن کو نہیں مانتے۔ حالاں کہ صورت حال یہ ہے کہ میرے لبوں پر تو ہنسی ہے لیکن میرا دل دوپٹے قم ہے۔ اب والد کی شرح اور صحیح کلام غالب بھی ملاحظہ ہو۔ "سوزش سبب گداز دل اور مبالغہ وہ گداز موجود محیط بے ساحل ہوا۔ اس کو شورش پڑھیں تو ابلغ ہو گا یعنی لفظ شورش بدوشین معجم بمعنی دیوانگی جس میں ایہام شور و دیا کا بھی ہے۔ چاہے تا دیوانوں کی دونوں حالت پر جو مصدر گر یہ د خندہ ہوتے ہیں دلالت کرے خافیم۔"

۳۴۔ عالم قہار وحشت مجنوں ہے سر بسر

کب تک خیال طرء لعلی کرے کوئی

اس شعر کی تشریح پر بھی شارحین متفق ہیں لیکن والد نے یہاں بھی ایک نئی اور مختلف بات کہی ہے۔ کہتے ہیں "عالم حیرہ و تار کو با قہار سیاحی کے طرء لعلی یعنی سامان زینت ہم خیال کرتے ہیں حالاں کہ عالم مذکور قہار وحشت مجنوں یعنی گویا بیان وحشت ہے۔"

۳۵۔ چال جھسی کزی کساں کا تیر

دل میں ایسے کی جا کرے کوئی

والد اس شعر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں "جس کی چال ایسی سخت و سجد ہوگی تو دل اس کا کیسا ہوگا۔"

۳۶۔ دعا عجز کشائے گلست دل ہے

آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ اکثر شارح اس شعر کے مطالب پر متفق ہیں لیکن والد کا انداز یہاں بھی مختلف ہے۔ کہتے ہیں "میں خواہاں اپنی گلست دل کے دیکھنے کا ہوں۔ آئینہ خانہ میں جا کر صورت پرستی کیا کروں۔ مجھے آئینہ خانے میں بھلا کوئی کیا لے

جائے گا۔ دوسرا پہلو محبوب اپنے ساتھ مجھے آئینہ خانے میں لیے جاتا ہے۔ مگر عاں کا یہ ہے کہ میری شکست دل کو وہاں قہار کرے بعد رنگ اس بات کے کہ عاشق کے دل کی طرف اس کی توجہ نہ ہوئی آئینہ خانہ کی طرف ہوئی۔

شعرا سلاسلہ المرحن ہیں۔ ان کا وجدان ایک آسمانی و سماوی چیز ہے جب کہ ان کی زبان ارضی۔ چنانچہ شاعری ارضی حقیقت اور سماوی تخیل کا اتصال ہے۔ اور ظاہر ہے یہ کس قدر مشکل کام ہے۔ الفاظ سلسلہ معانی کے ڈھلے ڈھلائے صاف سترے ٹھنڈے سخت فولادی سانچے ہیں اور اس لیے ایک ارضی حقیقت۔ شاعر کا تخیل اس کا فکر اس کی روح کے گداز کا سد چشمہ ہے، اس کے وجدان کا لاوا۔ سو یہ لاوا کبھی ان سانچوں کے مختلف المنیہ وجود کو نظر میں رکھ کر نہیں بہتا۔ یہ تو جب بہنا شروع کرتا ہے تو الفاظ کے یہ ارضی سانچے اس کے نیچے دب جاتے ہیں۔ اور پھر یہ ہوتا ہے کہ ہمارے شارمین و ناقدین لاوے کے نیچے سے ان کے دبے سانچوں کو ایک ایک کر کے نکالتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر صاف کر کے اپنی دانست کے مطابق ان کی درجہ بندی کر کے کسی پاکستان شناس کی طرح ان کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ وجدان کے اس اچھے سیلاب میں بہت سے سانچے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بہت سوں کی صورت بگڑ جاتی ہے، بہت سے سانچے ایک دوسرے میں جڑ جاتے ہیں اور اس طرح عام قاری ہی کے لیے نہیں نقادان فن کے لیے بھی مشکل ہوتی ہے کہ وہ شاعر کے اس گداز روح کو ارضی زبان میں سمجھیں اور سمجھائیں کہ یہ لاوا ان سانچوں کے سلسلہ خطوط کی ساری حدود توڑتا نظر آتا ہے۔ لیکن اس بنیادی قباحہ سے متاثر ہوتے ہوئے بھی شارمین و مفسرین ان سانچوں سے الفاظ نکالتے اور ان کے معنوی وجود کو متعین کرتے ہیں۔ عام نقاد کو جو سلسلہ معانی کے نقوش سے مغرب نہیں ہوتا اس حدود بھٹی کو زبان و بیان کے خلاف سمجھتا اور اکثر اس شاعری کو بے معنی ٹیال کرتا ہے۔ لیکن کوئی نقاد فن جو خود بھی وجدان کی اسی Frequency پر ہو کہ جس پر شاعر بہ وقت تخلیق تھا تو اس کو اس شاعری میں مطالب و معانی کے جہان نظر آتے ہیں۔ غالب کی اکثر شاعری وہ

قدیم دھیندہ ہے جو اس کے اپنے وجدان کے لاوے میں لپٹی ہوئی ہے۔ ہماری حقیقت پسندی (و نیاوی انسانی ہونے کے ناتے) بعدِ زمانی اور بے بسیرتی نے رفتہ رفتہ اس پر معنی کی اور تہیں چڑھا دی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تا حال اس شہرِ معنی کی بیرونی حدود بھی متعین نہیں ہوئیں۔ نہ جانے وہ کون صاحبِ بسیرت ہوگا اور کب جو اس کے نہاں خانہ معنی میں پہنچ کر اس کے شیشِ گل کے درو دیوار کے نقش و نگارِ اچال سکے گا۔

تقدیم کا نادر مرثیہ غالب

دلی سے چالیس پینتالیس میل شمال کی جانب ایک قصبہ سکندر آباد (ضلع بلند شہر) ہے جسے سکندر لودھی (۱۳۸۹ء تا ۱۵۱۷ء) نے بسایا تھا۔ اسی کے زمانے میں ایک بھٹاگر کانسٹھ بنام خواجہ دیپ چند، فیروز آباد، مضافات آگرہ سے نقل مکانی کر کے یہاں بس گئے۔ یہ لوگ آج بھی فیروز آبادی کہلاتے ہیں۔ اس خاندان کو بادشاہ کی طرف سے پانچ سو چالیس (۵۴۰) ٹککے پختہ معافی اور موردی منصب کا قانون کوئی عطا ہوا تھا۔

ان خواجہ دیپ چندی کی اولاد میں ایک صاحب موتی لال ہوئے جن کے آٹھ بیٹے تھے جس سبب سے وہ بعد میں ”آٹھ گھرے“ کہلائے۔ فشی ہر کو پال ان ہی موتی لال کے بیٹے تھے۔ یہ ۱۳۱۳ھ (۱۸۰۰-۱۷۹۹ء) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی کا شوق شروع سے تھا۔ انگریزی محکمہ بندوبست میں مدتوں قانون گو رہے۔ ۱۸۵۰ء میں تھوڑے عرصے کے لیے ریاست جے پور میں بھی ملازمت کا تعلق ہو گیا تھا لیکن جلد ہی مستعفی ہو گئے۔ ۲ ستمبر ۱۸۹۹ء (۱۵ رمضان ۱۳۹۹ھ) کو سکندر آباد ہی میں وفات پائی۔ ہمدردی کشن فروغ نے تاریخ وفات کہی:

من (کذا) میسوی مکلفم آخر فروغ

چہ سوے جہاں، زیر جہاں، تقدیر رفت

(۱۸۷۹ء)

مولوی مستاز علی تھانوی نے سہجری میں تاریخ لکھی:

سالِ تخلص ہا دل زارہ از خرو

من شنیدم ”بے سرو پا شد خن“

حسین علی خاں نے اپنے تذکرے ”نثرِ عشق“ میں لکھا ہے کہ قورالحسن واقعہ تھانوی کے دیوان کے مطالعہ نے ان کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا کیا۔ چوں کہ ذکاوت و استعداد سے وافر حصہ ملا تھا، اس لیے تھوڑی سی مشق سے بہت جلد ترقی کر گئے۔ نثرِ عشق میں جو انتخاب کلام ہے، اس میں تخلص راتمی ہے لیکن اس کے کافی عرصے بعد جب انھوں نے غالب کی شاگردی اختیار کی تو غالب نے تخلص بدل کر تقدہ اور مرزا کا خطاب دے کر ان کو مرزا تقدہ کر دیا۔ غالب کے محبوب شاگردوں میں تھے، چنانچہ انھوں نے ان کی تہذیب و حسین میں کوئی وقتہ فرو گذاشت نہ کیا۔ تقدہ بھی ساری زندگی غالب ہی کا دم بھرتے رہے اور ہمیشہ ان کو اپنا استاد رہنما اور مرشد مانا۔

تقدہ نے ساری زندگی قاری میں بسر کی۔ مالک رام کے بقول چار اور ڈاکٹر اکبر حیدری کے بقول پانچ ضمیمہ دیوان یادگار چھوڑے، اس کے علاوہ اپنے چھوٹے بیٹے فقیر سنگھ کی موت پر ’تضمینِ گلستان‘ بھی لکھی، جس کو غالب کے حقیقی باقر علی خاں کے نام متون کیا گیا، پھر سعدی کی ’بوستان‘ کے نتیجے میں اپنے عزیز دوست غفور علی کی دل واری کے لیے طویل مثنوی لکھی جس کا نام غالب کی فرمائش پر ’سہلستان‘ رکھا گیا۔ ان کی یہ ساری تصنیفات قاری میں ہیں۔ غالب کے شاگرد و رشید ہونے کے ناتے، اور پھر اپنی مستقل سعی و کاوش اور فطری استعداد کے سبب، ہندوستان کے قاری گوہوں میں ان کا مرتبہ صحیح طور پر آج تک متعین نہ ہو سکا۔ اس کی پہلی اور بڑی وجہ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے قائم ہوتے ہی قاری سکے رائج الوقت نہ رہی، دوسرے: باوجود اس قدر کثیر ادبی سرمایہ یادگار چھوڑ

جانے کے، ان کا کلام دستیاب نہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کے بقول فی الوقت ان کا صرف دو بیان دوم (مطبوعہ ۱۸۵۷ء) کا عمدہ اور مکمل نسخہ کتب خانہ شاہی لہوری (نمودہ)، تھکنو میں موجود ہے۔

اردو کی طرف انہوں نے بھی توجہ نہ کی، البتہ مختلف تذکروں میں صرف دو اشعار کا ایک قطعہ ملتا ہے جو انہوں نے غالب کی موت پر کہا تھا۔ اس قطعے سے ایک بار پھر اس بے مثال قلبی یکا گمت کا پتا چلتا ہے جو ان کے اور غالب کے درمیان تھی اور میرے خیال میں اردو کا یہ معمولی قطعہ اس شخص کی یاد میں ایک حقیر تذکرہ ہے جو خود اردو کا عظیم شاعر تھا۔ وہ قطعہ یہ ہے:

غالب وہ شخص تھا ہر دہاں جس کے فیض سے ہم سے ہزار بیچ ہاں نام در ہوے
فیض و کمال و صدق و وفا اور حسن و عشق چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پایاں ہوے
مرزا غالب اور تقی کے تعلقی خاطر کو مالک رام نے تقی اور غالب (از ڈاکٹر
محمد ضیاء الدین انصاری، مطبوعہ غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۷۳ء) کے دیباچے میں بڑی
اچھی طرح واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”لیکن غالب کے تقی سے تعلقات کا عالم ہی دوسرا ہے۔ ان میں
قرب و یکا گمت کا اندازہ اُن خطوط سے لگایا جاسکتا ہے جو غالب
نے تقی کو لکھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی خاندان کے
فرد ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملات میں شریک، فنی مسائل میں
مشورہ، لیکن دین، آپسی دکھ درد میں شریک۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ ایک میر مہدی بھارتی کے علاوہ کوئی دوسرا شاگرد استاد کے
اتنا قریب نہ تھا، جتنا تقی۔“

اگرچہ مرزا غالب عمر میں مرزا تقی سے دو سال چھوٹے تھے لیکن استاد کی رعایت سے تقی نے ہمیشہ حفظِ مراتب رکھا اور وضع و شریف شاعروں کی طرح اس مقدس اور محترم رشتے کو اس کے مرتبے سے نہ گرنے دیا۔ دونوں کی قلبی یکاگلی اس پائے کی تھی کہ غالب ان کو ایک دوست صادق الولا اور بھی اپنی اولاد اور بھی ان کے اشعار کو اپنے معنوی پوتے کہتے تھے۔ مرزا نے ایک سو چوبیس اُردو کے اور انیس فارسی کے خطوط میں جو القاب تقی کے لیے لکھے ہیں، وہ ان کی قلبی یکاگلی کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان خطوط میں ہمیں بھائی، مہاراج، پروردار، جانِ من و جانانِ من، نورِ نظر، تختِ جگر، کاشانہ دل کے ماو دو ہفتہ جیسے القاب نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے وسیع حلقہٴ احباب میں شاید ہی کوئی دوسرا شخص ہو جس کو غالب نے اتنی تعداد میں خط لکھے ہوں، پھر اس قلبی یکاگلی کا یہ حال تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے ہمہ وقت قرب چاہتے تھے۔ غالب کے بہت سے ایسے خط ہیں جن میں چند دن تقی کی خبر نہ ملنے پر غالب نے انتہائی تشویش میں پے در پے کئی خط لکھے ہیں اور بلا خربڑی تاکید کی ہے کہ:

”سنو صاحب! اپنے پر لازم کر لو، ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھا۔“

اگر کام پڑا تو دو تین خط، ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے

میں ایک بار بھیج دی۔“

تقی اور غالب کے اس قلبی تعلق اور قربتِ باہمی کی غواہی اس کا اظہار اس وقت خاص طور پر اور بھی شدت سے ہوا جب غالب ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے اور دو ماہ وہاں رہے، اور تقی، غالب کے لیے تڑپتے رہے۔ اس وقت تقی نے تجویز پیش کی کہ مجھے بھی رام پور ہی بلا لیجئے۔ اصولاً غالب اس تجویز پر راضی ہو گئے، چنانچہ اپنے خط میں لکھتے ہیں

”منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہتا ہوا تو فوراً تم کو بلا لوں گا۔“

جو دن زندگی کے باقی ہیں، وہ باہم بسر ہو جائیں گے۔“

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اس جواب سے تقہ متضمن نہیں ہوئے اور یہ سمجھے کہ غالب انھیں رام پور بلانا نہیں چاہتے۔ اس شبے کا اظہار انھوں نے یقیناً اپنے خط میں کیا ہوگا جس کے جواب میں غالب نے انھیں ان الفاظ میں سمجھایا:

”آفریز کے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں، اور تقہ کو اپنے پاس ہوتا

نہیں نہ مانوں؟ میں نے یہ لکھا تھا کہ بہ شرط اقامت بلا لوں گا،

اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر اقامت یہاں کی ٹھہری تو بے شمارے نہ

رہوں گا، نہ رہوں گا، نہ ہار نہ رہوں گا۔“

شاگرد و استاد کا یہ کلیسیا تعلق، کہ جو شاگرد و استاد کے رشتے سے بڑھ کر مرید و مرشد کے درجے پر پہنچ گیا تھا، چالیس سال تک قائم رہا۔ تقہ نے اپنے زریعہ نظر مرثیے میں یہی بتایا ہے:

در من و او یہ یاریء حتم

تا چهل سال ماند صحبت با

’ذکر غالب‘ میں مالک رام نے لکھا ہے کہ غالب کی وفات پر متعدد حضرات نے مرثیے اور تاریخیں لکھیں، ان میں سے حالی، مجروح اور سالک کے مرثیے مشہور ہیں۔

حیرت اس امر پر ہے کہ جب تقہ کے غالب سے تعلقات عالم آشکار تھے تو مالک رام جیسے دقیق نظر سوانح نگار سے تقہ کا مرثیہ صرف توجہ کس طرح ہو گیا؟ بہت ممکن ہے کہ اس

کی جہد وہی ہو جو ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے مقالے ”مرزا تقہ اور آؤدھ اخبار“ مضمون:

نوادیر غالب (مطبوعہ ادارہ یادگار غالب، کراچی) میں بیان کی ہے۔ فاضل مقالہ نگار

”آؤدھ اخبار ۲۶۔ اکتوبر ۱۸۶۹ء، ص ۱۰۳۲ تا ۱۰۳۹“ کی سرخی دے کر لکھتے ہیں:

”اخبار کا یہ شمار نہایت مفید اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں نقّہ نے واقعی غالب کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے۔ انھوں نے غالب کی وفات پر پندرہ بند کا ایک طویل ترجیع بند لکھا جس میں غالب کی سیرت کے علاوہ ان کے کلام کے محاسن بھی بیان کیے ہیں۔ یہ معرکہ آرا مرثیہ صرف آؤدھ اخبار تک ہی محدود رہا اور نقّہ کے کسی دیوان میں دست یاب نہیں ہے۔ نقّہ کا کوئی دیوان اب نہیں مل رہا۔ ذیل میں پورا ترجیع بند درج کیا جاتا ہے کہ محفوظ رہ سکے۔“

حقیقتاً میرے لیے بھی نقّہ کے اس مختصر تعارف کے ساتھ اس طویل اور واقعی معرکہ آرا مرثیے کے ترجمہ کرنے اور اصل فارسی متن کے ساتھ قارئین کو پیش کرنے کا یہی محرک تھا کہ یہ نایاب و بڑا اثر مرثیہ غالب دوستوں تک پہنچ کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔ اتفاق ایسا ہے کہ حالی کا ہی نہیں، مجروح اور سالک کے مرثیے بھی میری دست رس میں ہیں۔ میں نے ان کو بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھا اور خاطر خواہ حظ اٹھایا ہے لیکن نقّہ کے مرثیے کے ضمن میں ڈاکٹر اکبر حیدری سے سو فیصد متفق ہونے کے ساتھ ساتھ میں یہ کہنے کی جسارت بھی کرتا ہوں کہ یہ مرثیہ غالب اور نقّہ کے وسیع و عریض و عین قلبی و روحانی تعلق کا ہمہ جہت ترجمان ہونے کے باعث یقیناً چیز سے وگر ہے۔ لیجیے! مرثیہ پیش خدمت ہے:

۱

ہیں! چہ حوال ما محرم شد
سد اللہ خاں، ز عالم شد

ترجمہ: ارے! ہمارا حوال (تو) محرم ہو گیا
(کہ) اسد اللہ خاں کا انتقال ہو گیا

نہ شدی کاش! یک دو قرن وگر
راحتم رنج و شادیم غم شد

ترجمہ: ایک دو صدی کاش تم اور رہے، یہ نہ ہو سکا
میرا شکہ بھگن، رنج و غم میں داخل گیا

آہ از سینہ ام بیا پے خاست
انک از دیدہ ام وما دم شد

ترجمہ: مرے سینے سے آہ مسلسل نکلی
(کہ) میری آنکھوں سے آنسو زہر و شہ سے نہاں ہو گئے

حال او بود، آں کہ نیکو گشت
کار ما بود، آں کہ برہم شد

ترجمہ: اُس کا (اچھا) احوال (تو) درست ہو گیا
(تو) ہمارا حال چاہ ہو گیا

میں نے چہ غلغملہ کے عالمِ نہشت
سے کس آفتابِ شبنم شد

ترجمہ: میں کیا بتاؤں کہ مری تقدیر ہی پلٹ گئی
(میرا) چاند نازک پہنچا اور آفتاب (گولیا) شبنم ہو گیا

یک غلغملہ ہو آں کہ نامِ آدم
ہم چہ غائب چہ نسلِ آدم شد

ترجمہ: حضرت آدم کا ایک ہی (تو) نام آدم رہا
خلقِ غائب، تھا جو اس کی نسل میں پیدا ہوا

گفتنی نیست اُنہائے غم
یعنی ایں بس کہ پشتِ من غم شد

ترجمہ: اس کا غم قابلِ بیان نہیں
اتنا (کہنا) کافی ہے کہ (اس غم نے) میری کمر بھگادی

آں سخن در دے کہ شد ہے جاں
جاں ز جسم سخن ہاں دم شد

ترجمہ: اس شاعر کے جسم سے جان کیا نکلی
(گویا) بطن شاعری ہے جان ہو گیا

چوں نہ خوابد رمید از من و دل
نام آرام ماہ اگر دم شد

ترجمہ: ہم سے ہمارا دل کیوں نہ فرار کرے گا
کہ جب ہمارے آرام کا نام ہی "نوم" پڑ گیا

یادم آمد چو سیر دریا بش
الک جاری ز چشم پر خم شد

ترجمہ: مجھے اس کی دریا کی سیر جو یاد آئی
(تو بے اختیار) میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے

آں قدر ہا کہ درد دل افروز
آں قدر تا دم اینک مریم شد

۱۔ سخن میں افروز ہے جب کہ افروختہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ترجمہ افروختہ سے کیا گیا ہے۔

ترجمہ: درد دل نے اس کی منزلت اس حد تک بڑھائی
کہ ایک وقت اس کو مسیحا بنا دیا

جاں بدرد نوی مشرف غشت
دل پہ داغ کہن مکرم شد

ترجمہ: جاں کو مجھے درد کا شرف نصیب ہوا
(اور) دل کو پرانے داغ کا افتخار ملا

مرگ نادر و خور جاں گوید (کذا)
ناتوانم نہ می توانم شد

ترجمہ: (متن واضح نہیں)
میں کہ ناتواں ہوں توانا نہیں بن سکتا

از پدر و پسر چه ذکر و چه وقت
دل نہ سہراب و غم نہ رستم شد

ترجمہ: اس وقت (بھلا) باپ اور بیٹے کا کیا ذکر
(کہ) نہ ہی دل سہراب بن سکا اور نہ غم رستم ہوا

بے کئے او زیم چہ ایسی دو بلا
دہر کز دم سپہر ارقم شد

ترجمہ: اب اس ایک شخص کے بغیر میں (کیلا) جی رہا ہوں اور یہ دو بلائیں
زمانہ بچھو اور آسمان (میرے لیے) سیاہ ساپ بن گیا ہے

آفتابم رسید بر لب بام
لیکن اندہ نہ ذرا کم شد

ترجمہ: میرا آفتاب (زندگی) لب بام تک پہنچ گیا
لیکن میرا غم ذرا برابر بھی کم نہ ہوا

بادرم نیست، گویم از جبریل
کہ پراگندہ دل قراہم شد

ترجمہ: (اگرچہ) مجھے یقین نہیں آتا (کیوں نہ) جبریل سے پوچھوں
کہ کیا (غالب کا) پراگندہ دل بھتچ ہو گیا ہے

یا دگر شخص کو یہ ایسی کہ مرا
درد درماں و زخم مرہم شد

۱۔ اس شعر کا ایک اور مضمون بھی ہو سکتا ہے۔ ”مجھے یقین تو نہیں آتا۔“ (کیوں نہ) جبریل ہی سے پوچھوں۔ کیا اب لیکن
غالب کو نہ کر مضمون کے دل کو بھیج آ گیا۔ اگرچہ جبریل ہی مضمون کے ہی لیکن میں خواہاں کوئی نوٹ میں لکھ رہا ہوں۔

ترجمہ: ہا (یہ کہ) کوئی دوسرا شخص مجھے یہ بتائے
کہ (میرا) درد (میری) دوا اور غم (میرا) مرہم ہو گیا

ہر کچے راست میں غنّ برب
غیر بارغ الم کہ حرم شد

ترجمہ: ہر شخص کی زبان پر یہ بات ہے
(کہ غالب کی موت سے) سوائے بارغ الم کے کس کو طراوت ملی

ہر کہ از صبر لاف زد میں جا
چشم ادیاب عقل ملوم شد

ترجمہ: ہر وہ شخص جس نے اس موقع پر صبر کی شنی ماری
(وہ) عقل مندوں کے سامنے لائقِ الزام ٹھہرا

تاج من داغ و تخت من خاک است
تا جمن ملک غم مسلم شد

ترجمہ: (اب) داغ میرا تاج اور خاک میرا تخت ہے
(اور) جتنا تک سارا علاقہ غم کے زیرِ نگیں ہے

توبہ مکی آمدی و تاحقہ ام (کذا)
ہمد ود ودد غیر مقدم شد (کذا)

ترجمہ: (متن واضح نہیں)

داشت اغازہ ہائے یوسفوں
کز ز اسرار او چہ محرم شد

ترجمہ: گونا گوں اغازے رکھتا تھا
ہر وہ شخص کہ اس کے اسرار سے واقف تھا

گاہ آئینہ گاہ جام گرفت
گر سکند شد و گے جم شد

ترجمہ: کبھی آئینہ اور کبھی جام ہاتھ میں لیتا
(وہ) کبھی سکند اور کبھی جمشید بن جاتا تھا

ساقاں را جز ایں نہ نفع پہ لب
او نہ شد از زمانہ حاتم شد

ترجمہ: سالکوں کی زبان پر اب صرف یہ صدا ہے
عابِ نہیں بلکہ حاتمِ وقت سر گیا

علیٰ من و ہو چمن دعاگو را
خاطر آخلد طبع برہم شد

ترجمہ: بلکہ (اس کی موت سے) مجھ اور اُس جیسے دعاگوؤں کی
طبیعت افسردہ اور دل پریشان ہو گیا

شدہ آغوشِ چشم، خوں شدہ دل
تکنہ کوئی پیاو زم زم شد

ترجمہ: دل خوں شدہ، آغوشِ چشم بن گیا ہے
(جس طرح) کوئی پیا سا چاؤ زم زم میں گر چڑے

ورچہ ہنسی چہ شدہ ہما ایں نوع
سود عالم تمام ماتم شد

ترجمہ: اور اگر یہ پوچھو کہ کیا ہوا، (بھلا) یہ حالت کیوں ہے
(کہ) دنیا کی شادمانی، ماتم میں بدل گئی

فخر مرئی و رنج غائبِ مرد
اسد اللہ خاں غائبِ مرد

ترجمہ: (قربانیت یہ ہے کہ) فخر مرئی و رنج غائب (آملی)
اسد اللہ خاں غائب کا انتقال ہو گیا

۲

اسد اللہ خاں نہ تھا رفت
میرٹھل جان ما دل ما رفت

ترجمہ: اسد اللہ خاں (اس دنیا سے) اکیلا نہیں گیا
اس کے ساتھ ہماری جان اور ہمارا دل (بھی چلے گئے)

خننِ افسردہ دل خننِ درِ نرد
معنی آزدہ معنی آرا رفت

ترجمہ: خننِ درِ مرا (تو) خننِ آزدہ ہو گیا
معنی کو زیب و زینت دینے والا مرا (تو) معنی افسردہ ہو گئے

رفت آں حالتے پہ من کہ میرس
تا شنیدم کہ او ز دنیا رفت

ترجمہ: میری ایسی حالت ہو گئی کہ قابلِ بیان نہیں
جب میں نے یہ سنا کہ وہ دنیا سے چلا گیا

انک پُ شہر از ثنی بگذشت
آہ پُزور تا ثریا رفت

ترجمہ: پُ شہر آفسو زمین کی تھا، تک پہنچ گئے
(اور) پُ زور آہ ثریا تک پہنچ گئی

گرچہ آو رفت از جہاں آما
یاد آو از دلم نہ اصلا رفت

ترجمہ: اگرچہ وہ اس دنیا سے چلا گیا
(لیکن) اس کی یاد میرے دل سے ہرگز نہ گئی

فصل داوند ہر مکش پس مرگ
دیدنی از دیدہ با چہ دریا رفت

ترجمہ: مرنے پر جب اس کو فصل دیا گیا
(تو) تو نے دیکھا لوگوں کی آنکھوں سے کیسے دریا چگے

رفت روحی ہے بہشت المادئی
اس کے کوپے کہ او ز مادئی رفت

ترجمہ: اس کی روح (بہشتی) جنت المادئی چلی گئی
یہ جو کوئی کہے کہ وہ اپنے گھر سے چلا گیا

نوری ریخت از جنازہ او
عالیٰ از پہ تماشای رفت

ترجمہ: اس کے جنازے سے ایک (ایسا) نور برس رہا تھا
(کہ) لوگ اس کے تماشے کے لیے گئے

من چو بختم از و نکاں جبرئیل
گفت چو من بعث علی رفت

ترجمہ: میں اس کو تلاش کر رہا تھا (تو) جبرئیل نے
کہا کہ وہ تو میری طرح عرش معلیٰ پر پہنچ گیا

دو ہائے مرا دوا او بود
چوں نہ مہرم کنوں مسحا رفت

ترجمہ: میرے غموں کی دوا تو وہی تھا
اب کہ مسیحا ہی جا چکا ہے (تو) میں کیوں نہ مر جاؤں

و ز غمش رفتی ست جاں ز تنم
مگر نہ امروز رفت، فردا رفت

ترجمہ: اس کے غم میں میرے جان جانی ہی جاتی ہے
اگر آج نہیں گئی تو کل گئی

گفت از صبر من کہ بخت نکاں
پہ مقامے کہ ذکر عفا رفت

ترجمہ: میرے صبر کا پتا جس نے بھی لگایا
(تو) اس جگہ سے کہ جہاں تک ذکر عفا گیا

وہ چہ ایں آدم چہ آں رفتم
حسرت آمد پہ دل تنها رفت

ترجمہ: ہائے! میرا آنا اور جانا تو اس طرح ہے
گویا دل سے تنها گئی اور حسرت آگئی

از دور یاس کاں نہ دامنِ گشت
رہم کو کہ طاقت از پا رفت

ترجمہ: مایوسی کے دور سے کیوں کر انہوں سمجھ میں نہیں آتا
(اور) پاؤں تو کہاں کہ پاؤں سے طاقت نکل گئی ہے

تا چہ آید بہانِ من فردا
آں کہ امروز بود یکنا رفت

ترجمہ: میری جان پر کل (بہانے) کیا مصیبت آئے
آج کے دن (تو غالب) تنہا ہی چلا گیا

انچہ بر من نہ از وفاتِ کسے
چش ازیں رفتہ بود حالا رفت

ترجمہ: اس سے پیش تر کسی کی موت پر
مجھ پر وہ کچھ نہیں چٹا جو اب بیت گیا

چوں نہ قرباں روم جہاں را
برمن و جانِ من جہاں رفت

ترجمہ: جفاؤں کے کیوں نہ قربان جاؤں
کہ مجھ پر اور میری جان پر جفا کیں آ پڑیں

انچہ ی خواتم نہ گشت نصیب
انچہ می داتم بہ یغنا رفت

ترجمہ: میں جو چاہتا تھا مجھے نصیب نہ ہوا
(اور) جو میرے پاس تھا وہ لٹ گیا

چش ازو چوں مرا نہ کرد ہلاک
و ز من و مرگ ماجرا رفت

ترجمہ: (غالب) سے پہلے مجھے ہلاک کیوں نہ کیا
(اس بات پر) موت کے ساتھ میری بڑی وارداتیں ہو گئیں

بود ہر پلچہ کوہ پا بہ جا
نالہ ام چوں شنید از جا رفت

ترجمہ: (موت) ہر چہہ کا پانی (کرتی پر) پہاڑ کی طرح ڈلی رہی
لیکن میرے نالے سن کر تل گئی

میر شد اضطراب در غمِ او
یا نہ ی رفت دل ز خود یا رفت

ترجمہ: اس کے غم میں اضطراب غصہ پڑ گیا
یا تو دل ہوش و حواس میں تھا یا (یک دم) بد حواس ہو گیا

رفت تقدیر و گفت من تا چار
ہم تا رفتی بمن تا رفت

ترجمہ: میری تقدیر پلٹ گئی تو مجھ بے بس نے کہا:
یہ ساری ناشدنی میرے ساتھ ہی ہوتی تھی

تقتے ہے او چو خلعت دیوانہ
چہ قدر رہا بہ کوہ و صحرا رفت

ترجمہ: غالب کے نہ ہونے سے تفتہ دیوانہ ہو گیا
اور پھر کیا کیا کوہ و صحرا میں پھرتا رہا

باز چوں خواند پیش خویش مرگ
چہ گویم چہ ہے کاہا رفت

ترجمہ: اور پھر جب مرگ نے غالب کو اپنے سامنے بلا دیا
تو کیا بتاؤں وہ کیسا بے دھڑک چلا گیا

چوں یہ دہلی روانہ کروم خط
خیر آمد حضور والا رفت

ترجمہ: میں نے دہلی خط بھیجا
تو معلوم ہوا کہ حضور والا تو رخصت ہو چکے ہیں
یا۔۔۔ تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ کے حضور پہنچ گئے

.....

ہو تا کہے کہ با حافظ
اندوہی روز با ہاتا رفت

ترجمہ: ایک شخص کہ جو حافظ کی نظیر تھا
ان دنوں وہی رخصت ہو گیا

کفتم اکٹوں غموش باید نامہ
چوں حکایت ز جام و مینا رفت

ترجمہ: جام و جینا کی جب بات ہوئی
(تو) میں نے کہا ان دنوں خاموش رہنا چاہیے

لکس خود کشم و ہر داود
ہر زبان ہر مگزم نہ حاشا رشت

ترجمہ: میں سانس تو (بدستور) لیتا ہوں لیکن (اس) منصف کے لیے
میری زبان پر کبھی شکوہ نہ آیا

دشت از غویہم دلم را بد
گاہ ای جا و گاہ آں جا رفت

ترجمہ: دشت نے مجھے حواس باختہ کر دیا
(میرا دل) کبھی ادھر جاتا، کبھی ادھر جاتا

من نہ کلم جز ای بہ جلہ شعر
تاز عرق و طالب ایما رفت

ترجمہ: میں نے کسی جلہ شعر میں سوائے اس کے
کہ تاز عرق اور طالب نشان شخصیت رخصت ہو چکی ہے، اور کچھ نہ کہا

فخرِ مرکی و رنگہاں غالبِ مرد
اسد اللہ خاں غالبِ مرد

ترجمہ: فخرِ مرکی اور رنگہاں غالب
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۳

اے کہ با انوری برابر ہو
مخلص جملہ میر انور ہو

ترجمہ: اے وہ مخلص کہ انوری کے برابر تھا
اس کے تمام شعر آفتابِ انور تھے

پیشِ آں پیشِ کو بہ فنِ سخن
پیشِ تر آں کہ ہو، کم تر ہو

ترجمہ: سخن ہی میں اس ہر اک سے بہتر شعر کہنے والے کے مقابلے میں
ہر ایک کا بہتر کہا ہوا بھی کم تر تھا

در سپاہِ کلام شیرینش
تر زباں آں کہ ہو کوثر ہو

ترجمہ: اس کے کلام شیریں کی سپاس گزاری میں
جسے کوڑ بھی تر زبان تھا

شوکتِ خسرواں چناں نہ بود
رجہ اش غوثِ خلق دیگر بود

ترجمہ: بادشاہوں کی شان بھی ایسی نہیں ہوتی
لوگوں میں اس کا مرتبہ اور طرح کا تھا

شہرت او پہ ہفت چرخ ہنوز
ایں کہ گوید پہ ہفت کشور بود

ترجمہ: اس کی شہرت تو سات آسمانوں میں آج بھی ہے
بھلا پہ کس نے کہا کہ ہفت کشور میں تھی

لفظے از دے ہزار معنی داشت
حرفے از دے ہزار دفتر بود

ترجمہ: اس کے ایک لفظ کے ہزاروں معنی ہوتے تھے
(اور) اس کا ایک حرف ہزار دفتر کے برابر تھا

از نکاحی ہم آں کہ بعد سنی
ہم الما نظم المہر بود

ترجمہ: وہی تھا جو نکاحی سے بہت لے گیا
وہ شاعروں کے سر کا تاج تھا

تاچ روشن کلام او کوئی
نظم او ماہ نظم اختر بود

ترجمہ: اس کا کلام ایسا روشن تھا گیا
نظم چاند اور نظم ستارہ تھا

بعد او بودن کے معلوم
وہ حیاتش باو کہ ہم سر بود

ترجمہ: اس کے بعد (اس مرتبے پر) بھلا کون پہنچ سکتا ہے
جب اس کی زندگی میں کوئی اس کا ہم سر نہ ہوا

چہ بلیغی غورم قسم صد ہار
کز دل و جاں فدائے حیدر بود

ترجمہ: میں بھئی کی سو ہار قسم کھا کر کہتا ہوں
وہ دل و جان سے حیدر پر فدا تھا

انچہ می یافتنے پہ غولیش نہ داشت
و انچہ می خواستے منیر بود

ترجمہ: جو کچھ بھی اس کو حاصل ہوتا، اپنے پاس نہ رکھتا
اور جو کچھ بھی مانگتا، مل جاتا تھا

بود از بس صفا بہ آب بگش
نہ تخفیدم کہے سکدر بود

ترجمہ: اس کی فطرت میں اس پایے کی صفائی تھی
کہ کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ کسی کی طبیعت سکدر ہوئی ہو

ہر دو او ہزار کس موجود
خود و لیکن، حقیقہ یک دو بود

ترجمہ: اس کے ہاں ہزاروں لوگ موجود ہوتے
لیکن وہ ایک جگہ پر ہی مقیم رہتا

چہ خوش این صفت کز چہ مجمع عام
شکلش بس کہ روح پور بود

ترجمہ: کسی نے مجمع عام میں سے کیا خوب کہا ہے
کہ اس کا کلام روح پور تھا

ق
چہ قدر با چہ تہ دلانِ سخن
اسد اللہ خاں دلاور بود

ق
ترجمہ: بہادرانِ سخن کے مقابلے پر
اسد اللہ خاں کس قدر بہادر تھا

کج کسانے کہ راہ می رھد
بہر شاں رہ نما چہ سطر بود

ترجمہ: راوِ سخن میں جو لوگ کج راہ تھے
ان کے لیے غالب سطر کی طرح راہ نما تھا

تاچہ از کس حسد چہ حکم او را
آں قدر قدرت از مقدر بود

ترجمہ: کسی کو اس کی شاعری پر اس سے حسد کا کیا جواز ہے
یہ تو معنیٰ ہی کا فیصلہ تھا

مر کے نذر پیش آوردے
کے گرنے دیش تو مگر بود

ترجمہ: اگر کبھی کوئی نذرانہ اس کو پیش کرتا
(تو) قبول نہ کرتا اس کا دل ایسا سیر چشم تھا

ککتہ داشت در سخن کز دے
مغر روحانیاں معطر بود

ترجمہ: اس کی شاعری میں وہ ککتہ آفرینی تھی
(کہ) فرشتوں کا دماغ معطر رہتا

صرعے عالمے مسخر کرد
تج او را در چہ جوہر بود

ترجمہ: اس کا ایک مصرع نے دنیا - مسخر کر لیتا
یہی تو اس کی سکوار کا جوہر تھا

صحنہ طبع او جزاک اللہ!
ہر چہ ی گفت جملہ گوہر بود

ترجمہ: جزاک اللہ! اس کی کان طبع ایسی تھی
کہ اس قلم سے جو بھی لکھا، موتی ہی ہوتا تھا

ہر روحانیاں کلمہ اقرار
او نہ روحانیاں مقدر ہو

ترجمہ: سارے فرشتے یہ سمجھتے ہیں
کہ وہ بھی ایک فرشتہ ہی تھا

تم نہ جھید کس نہ جانم
وہ گفتش آں زماں کہ ساغر ہو

ترجمہ: کوئی اس کو جھید سے کم نہیں سمجھتا تھا
جس وقت اس کے ہاتھ میں ساغر ہوتا

از فردغ وجود او ہر دم
خوان او تا چہ منور ہو

ترجمہ: اس کے وجود کی روشنی سے
اس کا خوان (فیض) کس قدر منور تھا

سید فرہ پہ نام ی آورد
میل او کے پہ صید لائے ہو

ترجمہ: وہ ہمیشہ سونا چھار چال میں پھانست
کبھی لاغر چھار کی طرف توجہ نہ کرتا

قی

یعنی آں معنی بلند کزو
سدہ ہم پست و ہم فرد تر بود

قی

ترجمہ: یعنی (اس کا دام فکر) ایسے معنی بلند دام میں لانا
کہ سدہ بھی پست اور فرد تر معلوم ہوتی

آزمودم ہزار بار ایسی را
چیشا کو کم تر از خرف در بود

ترجمہ: میں نے ہزار بار آزما کر دیکھا
اس کی نظر میں دھوپ سے بھرے بھی کم تر تھا

از دگر علم تا چہ حرف، او را
ہمہ علم الہی ازیر بود

ترجمہ: دوسرے علوم کی کیا بات کی جائے
اس کو سارا علم الہی ازیر تھا

الغرض بعد نرغش پہ زباں
خیر الہی نقد را نہ دیگر بعد

ترجمہ: الغرض، اسی کے مرنے کے بعد
نقد کی زبان پر صرف یہی الفاظ تھے

فخر عرق و رنجِ طالبِ نرد
اسد اللہ خاں غالبِ نرد

ترجمہ: فخر عرق اور رنجِ طالبِ طالب
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۳

اسد اللہ خاں نہ مائدہ افسوس!
فخر ہندوستان نہ مائدہ افسوس!

ترجمہ: افسوس! اسد اللہ خاں (دنیا میں) نہ رہا
افسوس! فخر ہندوستان نہ رہا

ابن نہ گویم کہ آں نہ مائدہ افسوس!
وہ تو خلقِ جاں نہ مائدہ افسوس!

ترجمہ: میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ نہیں رہا
بلکہ افسوس! حقوق کے جسم میں جاں نہ رہی

نام آئینہ ساں نہ چوں حیراں
طوطی خوش بیاں نہ نامہ افسوس!

ترجمہ: میں آئینے کی طرح حیران کیوں نہ ہوں
(کہ) افسوس! طوطی خوش بیاں نہ رہا

رفت بے کوئی سامعین غم
لب او ذرفٹاں نہ نامہ افسوس!

ترجمہ: سامعین کے کانوں پر (بڑا) غم ہوا
افسوس! اس کا لبِ ذرفٹاں نہ رہا

ہوستان ہوا دلی و ہے او
روشن ہوستان نہ نامہ افسوس!

ترجمہ: دلی تو ایک باغ تھا، اب اس کے بغیر
افسوس! باغ کی روشن غم ہو گئی

خاندانِ را دگر چہ نامہ شرف
شرفِ خاندان نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: خاندان کے لیے اب کوئی وسیلہ عزت ہی نہ رہا
افسوس! خاندان کی عزت مٹ گئی

علمِ آؤ نامہ جاوداں تھا
خریشتم جاوداں نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: اس کی شاعری تو جاوداں ہو گئی
لیکن افسوس! خود اس کا وجود جاوداں نہ ہو سکا

بود جانِ جہاں خود آں کہ دگر
نظمے در جہاں نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: وہ تو اس دنیا کی جان تھا لیکن
افسوس! کہ کوئی دوسرا (ایسا) دنیا میں نہ رہا

کاروانِ دگر کچا نامہ
بود یک کاروان نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: دوسرا کارواں کہاں ٹھہرے گا
ایک ہی کارواں تھا، افسوس! جب وہ بھی نہ رہا

آسمان و چٹانیں ستم برد من
اثر اندر فغاں نہ ماندا، افسوس!

ترجمہ: آسمان کے ایسے ستم میرے اوپر ہیں
افسوس! کہ میری فغاں میں اثر باقی نہ رہا

دہر را غم گرفت زیر نگیں
عہم شادی رواں نہ ماندا، افسوس!

ترجمہ: غم نے زمانے کو سحر کر لیا
اور افسوس! شادمانی کی سلطنت ختم ہو گئی

کز چہ پرسیدہ اند و ہم کلم
کہ بہ کام زباں نہ ماندا، افسوس!

ترجمہ: لوگوں نے پوچھا بھی ہے اور میں نے بتایا بھی
کہ افسوس! میرے تالو سے میری زبان نکل گئی

۱۔ اس مصرعے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ افسوس اب میری زبان کا کوئی مقصد ہی نہ رہا۔

چند کریم نہ ماند خوں پہ جگر
چند گویم فلاں نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: کس قدر زاری کروں، جگر میں قطرہ خوں باقی نہیں
اور افسوس! کب تک تناؤں کہ فلاں شخص مر گیا

بر لبِ آں کہ مردش چہ شنید
تا قیامت چہاں نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: اس کی زبان پر کہ جس نے اس کی وفات کی خبر سنی
افسوس! قیامت تک کیسے کیسے نالے نہ رہے

من بہ خاکش چہ بگورم مجھا
دل در خوں تہاں نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: اب میں اس کی قبر پر اکیلا کیا جاؤں
اے افسوس! خوں میں تر پنے والا دل ہی نہ رہا

ہر کہ پسد چہ صدمہ اش گویم
رہ سوے آسماں نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: کوئی پوچھے تو اس کو کیا سانچہ بتاؤں
افسوس! آسمان کی طرف کا راستہ ہی بند ہو گیا

ناز برصیر خوشن دل داشت
ہر چہ دل داشت آن نہ ماند افسوس!

ترجمہ: دل کو اپنے صبر پر بڑا ناز تھا
لیکن افسوس! دل کے پاس جو کچھ بھی تھا نہ رہا

تا بہ دارالاماں چہ بے اد ذکر
اندویش دار اماں ماندہ افسوس!

ترجمہ: اس کے بلیغہ دارالاماں کا کیا ذکر کیا جائے
کہ افسوس! اس گھر سے اماں بھی اٹھ گئی

داشت صد رو جوانی از یک ہر
وقت دوراں جواں نہ ماند افسوس!

ترجمہ: ایک ہڑھے کے ویسے سے بیکڑوں اسبابِ جوانی میسر تھے
لیکن افسوس! راجی وقت ہی ہوڑھا ہو گیا

شاو و خرم دلم چناں کہ نامہ
چین ازیں، چناں نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: اس سے پہلے جیسا شاو و خرم میرا دل
ہوا کرتا تھا افسوس! اب ویسا نہ رہا

چہ کیے رخصت و من یک ہار
تاب رفت و توان نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: ایک اس کے چلے جانے سے یک ہارگی
افسوس! ساری تاب و توان ہی زائل ہو گئی

دل من ہم چہ سینہ چوں نامہ
کاں کہیں در مکاں نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: میرا دل سینے میں کس طرح ٹھہرے
.. جب افسوس! وہ کہیں ہی مکاں میں نہ رہا

شفقت و مہر ہر دو گشت فنا
مشفق و مہرباں، نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: شفقت و محبت، دونوں ہی فنا ہو گئیں
چوں کہ افسوس! عشق و صبریاں ہی نہ رہا

گفت کس آں زماں کہ غالب مرد
بچ دو دے گماں نہ ماندا، افسوس!

ترجمہ: غالب کے مرنے کا چرچا تو اس وقت ہوا
جب افسوس! اس امر میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہا

سن زمانے کہ شادی ماحم
کو دگر آں زماں نہ ماندا، افسوس!

ترجمہ: کبھی میں بھی خوش ہوا کرتا تھا
افسوس! اب وہ وقت نہ رہا

تا چہا خوں شد و ز ویدہ چکید
رازِ این دل نہاں نہ ماندا، افسوس!

ترجمہ: کیا کیا خوں ہو ہو کر آنکھ سے چکا
افسوس! دل کا راز پوشیدہ نہ رہ سکا

آں کہ پامش پہ ہر کچا شبنوی
از وجودش نشان نہ ماندہ افسوس!

ترجمہ: اُس شخص کا نام تو ہر جگہ خائی دیتا ہے
لیکن افسوس! اس کے وجود کا نشان باقی نہ رہا

مشتو خاکے کہ بر سر افغانم
اندوہی خاکداناں ماندہ افسوس!

ترجمہ: افسوس! مٹی بھر خاک کہ میں اپنے سر پر ڈال سکوں
اس خاک دان میں مٹی نہ رہیں

میںہاں سد ہزار بر سر غواں
ایک یک میزبان نہ ماندہ افسوس!

ترجمہ: لاکھوں مہمان دستر خوان پر بیٹھے ہیں
لیکن افسوس! ایک میزبان باقی نہ رہا

سائل آ کہ چہ بود آں دل دوست
طیرت بحر و کلاں نہ ماندہ افسوس!

ترجمہ: وہ دل دار کیا کہہ سائل آگاہ تھا
 افسوس! وہ رشتہ بزدل کاں نہ رہا

تا چ کے نقشہ پر لب ایں دستاں
 تا کیا یہ زباں نامہ افسوس!

ترجمہ: نقشہ! یہ نقشہ غم کب تک؟
 اور زباں پر "نامہ افسوس" کہاں تک رہے گا

فخر مرثی و رشتہ طالبِ مُرد
 اسد اللہ خاں طالبِ مُرد

ترجمہ: فخر مرثی و رشتہ طالب
 اسد اللہ خاں طالب کا انتقال ہو گیا

۵

ایک دل است و ہزار غم چہ کسم
 نہ کسہ دم مرگ ہم چہ کسم

ترجمہ: ایک دل ہے اور ہزاروں غم، کیا کروں
 موت بھی دم نہیں کرتی، کیا کروں

اے کہ کوئی کہ صبر کن "۔ ۔ روز
ذبحی است یک " دم چہ ستم

ترجمہ: اے طالب! ٹو جڑ کہتا ہے کہ ایک دو روز صبر کر
سہی دعا کی ہی ایک دو روزوں سے دعا کر نہیں، کہا کروں

عقد و دوم و پنجم و ششم
چهارم آزادی می بینیم

ترجیم: آسمان و زمانہ و قسمت مجھے آزاد
 دینے کے لیے تیار ہو گئے ہیں، کیا کروں

چوں نہ سازم چرخ زای ۱
فلکم محنت جملہ نیم چرخم

ترجمہ: اپنی ناکامیوں سے کس طرح نہ جانوں
میری ساری شادیانی زہر ہو گئی ہے، کیا کروں

اے کہ مکی حور دماغ مرا
شرع احمد خلیق کسم چہ سہم

ترجمہ: اے مخاطب! تُو جو کہتا ہے کہ میرا دماغ نہ کھا! میں اپنے قصۂ غم کو کس طرح مختصر کروں

تاچہ نہ نمود نہ بہن نمود (کذا)
 شکوۂ طالع دوم، چہ کسم

ترجمہ: سخن واضح نہیں
 اپنی بد قسمتی کا کیا کلمہ کروں

مریہ ی خواہم کسم بہ عمر
 چوں بہ چشم نماند غم، چہ کسم

ترجمہ: خواہش تو یہ تھی کہ ساری عمر روتا ہی رہوں
 لیکن اب تو آنکھیں بھی خشک ہو گئیں، کیا کیا جائے

بگوم من چساں د سوز و گداز
 کدازو مرا الم، چہ کسم

ترجمہ: سوز و گداز سے مجھے کس طرح نجات ملے
 غم میرا پیچھا نہیں چھوڑتا، کیا کروں

تاچہ کے دل کھنڈ نغماں چہ علاج
تا کھا من کھنڈ ختم، چہ کھنڈ

ترجمہ: دل آہ و زاری کب تک کرے گا، اس کا کیا علاج ہے
اور میں کب تک ختم اٹھاؤں گا، آخر کیا کیا جائے

اسد اللہ خاں غالب دست
کمر اکٹوں سوے عدم، چہ کھنڈ

ترجمہ: اسد اللہ خاں غالب نے اب
راہ عدم کے لیے کمر کس لی، کیا کروں؟

رقم من انچہ کرم اعجاز است
سند او جزیں رقم، چہ کھنڈ

ترجمہ: میں نے جو کچھ تحریر کیا، وہ اعجاز ہے
اپنے حق میں غالب کی اس سند کے علاوہ کیا پیش کروں

جا بجا گرم و چڑ اوے را
یاہم اصلا نہ در عجم، چہ کھنڈ

ترجمہ: جا بیجا تلاش کروں اور اُس جیسا ایک بھی
جگم (ایران) میں بھی نہ ملے تو کیا کروں

در غمش شرح ناتوانی خویش
از کھم چوں کند قلم، چہ کنم

ترجمہ: اس کے اظہار غم میں جب
میرے ہاتھ کا قلم بھی اپنی عاجزی پیش کرے تو کیا کروں

بود چہ از ارم چہ او بود
گر دہندم بے او ارم، چہ کنم

ترجمہ: اس کی رفاقت جنت سے بہتر تھی
اگر اس کے بغیر جنت بھی مجھے دیں تو میں میرے کس کام کی

سجدہ گاہ من آستانش بود
سوے خراب پشت غم، چہ کنم

ترجمہ: اس کا آستانہ میری سجدہ گاہ تھی
اب مسجد میں سجدہ کیا کروں

آن سفالیں پیالہ چوں اکٹوں
از نقش نیست جام جم، چہ ستم

ترجمہ: وہ مٹی کا پیالہ اب اگر اس کے ہاتھ سے مجھے نہیں مل رہا
تو میں جام جم کا کیا کروں گا

یا آرد می شنیدم آن کلمات
یا شنیدم این زباں امم، چہ ستم

ترجمہ: یا تو میں اس کی باتیں سنا کرتا
اور اب یہ دلت آگیا ہے کو یا بہرا ہو گیا ہوں، کیا کیا جائے

ان کما رام بودم اکٹوں کو
نہ ستم گر نہ غولیش رم، چہ ستم

ترجمہ: میں جس کا ارادت مند تھا، اب کہاں ہے
اب اگر اپنے سے بھی فرار نہ وحوشوں تو کیا کروں

آن کہ ہے دوست زندگی ہم بیچ
خود ہے آرد می خورم قسم، چہ ستم

ترجمہ: وہ کہ جس کے بغیر زندگی ہی بے معنی ہے
اب اس کی قسم کھانے کے علاوہ اور کیا کیا جائے

قبرِ او قسم از حرمِ کم نیست
تا بود قبرِ او حرم، چہ قسم

ترجمہ: اس کا حزار میرے لیے حرم سے کم نہیں
اس حزار کو حرم بنانے کے لیے کیا کروں

عقلم آں کہ بود رفت اکنوں
چرخ اگر عقلم حشم، چہ قسم

ترجمہ: اب صاحبِ خشم تو جا چکا ہے
آساں مجھے خشم عطا کرے بھی تو میرے کس کام کا

شاہِ یوم چو بود او اکنوں
من فقیرم خشمِ خدم، کم

ترجمہ: جب وہ زندہ تھا تو میں بادشاہ تھا
لیکن اب تو فقیر ہوں، سو خشمِ خدم میرے لیے بے کار ہیں

یاد آن راحت کہ با او بود
دہم رنج دم بہ دم، چہ کنم

ترجمہ: اس راحت کی یاد کہ جو اس کے سبب تھی
گھڑی گھڑی آکر مجھے دکھ دیتی ہے، کیا کروں

ایں ہمہ کرد باز کوچہ دہر
تج بہ ناکسے علم، چہ کنم

ترجمہ: یہ حتم کرنے کے بعد بھی زمانہ کہتا ہے
کہ کسی بے حیثیت پر تلواریں نہ اٹھاؤ، کیا کروں

حیف! نرد آن کہ ہر زماں ی کرد
بہن آن لطف، آن کرم، چہ کنم

ترجمہ: افسوس! وہ شخص کہ مجھ پر ہمیشہ
کیسے کیسے لطف و کرم کرتا تھا، اب میں کیا کروں

طلبہ با خودم اجل و ز ضعف
بہ نہ خیزد مرا قدم، چہ کنم

ترجمہ: موت چاہتی ہے کہ میں اس کے ساتھ ساتھ رہوں
لیکن ہمت نہ تو اتنی ہے میرا قدم نہیں اٹھتا، کیا کروں

ہاں کلیم من و کلمہ ادا
ہے کلیم چوں منجم، چہ کسم

ترجمہ: مجھے مبر نہیں آ رہا لیکن دشمن
مجھ پر مبر کی تہمت لگا رہے ہیں، کیا کروں

بر دم ی شود فزوں ہے او
رنج بر رنج و غم ہے غم، چہ کسم

ترجمہ: ہر لکھ اس کے بغیر
میرا رنج و غم بڑھتا ہی جا رہا ہے، کیا کروں

خود فغانم چہ کم چہ ہرزہ دادم
کوش بر ہانگہ زیروم، چہ کسم

ترجمہ: میری فغان کیا کم ہے کہ فضول ادھر ادھر بھاگوں بھی
اور آوازوں کے زیروم ہم پر کان بھی دھروں

یہ دور ماضی دلم کہ سر
شد یہ دیوانگی علم، چہ ستم

ترجمہ: میرا دل فردا کی کے کیف میں تھا کہ یکا یک
ایک صبح دیوانگی کے عالم میں برا بیعتہ کھڑا ہو گیا، کیا کروں

تقدیر! از دور من نہ ای آ کر
مگر نہ ہر دم فغاں ستم، چہ ستم

ترجمہ: اے تقدیر! تجھے میری دکھ سے آگاہی نہیں
میں ہر دم آہ و زاری نہ کروں تو اور کیا کروں

فخر عرقی و رشکِ غالبِ مُرد
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

ترجمہ: (نثر) فخر عرقی و رشکِ غالبِ مُرد
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۶

میرزا غالب، آہا غفلت یہ کور
چوں نہ پاشم کفنِ سنا مجبور

ترجما: آہ! میرزا غالب قبر میں جا سویا
میں فراقِ زود (اس غم میں) کتنی کیوں نہ پہن لوں

میرزا غالب، آہ! زود نہ مانو
چوں نہ ہاشم من از حیات کفور

ترجما: ہائے! میرزا غالب زود نہ رہے
سو میں زندگی کو کیوں نہ شکر اؤں

میرزا غالب، آہ! قصیدِ عدم
کہ خود اختیار د من مجبور

ترجما: ہائے! میرزا غالب راضی ملکِ عدم ہوئے
اور میں فرقتِ زود رہ گیا

میرزا غالب، آہ! اندر خلل
سرخوش د من بنور طالبِ حور

ترجما: آہ! میرزا غالب جنت میں سرخوش و سرشار ہیں
اور میں تا حال طلبِ حور میں جلا ہوں

۱۔ حسن میں پہلے مصرعے میں معنہ ہوتا ہے ملکِ ملک، رہ گیا ہے۔ ترجمہ اس ملک کے ساتھ کیا گیا ہے۔

میرزا غالب، آہ! نزدیک است
چہ ہزاراں سرور و من زد دور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کمال سرور میں
ہیں لیکن میں ان سے دور ہوں

میرزا غالب، آہ! بے من خاست
ایں قدر چوں سرور نا محصور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب میرے بغیر
نعمت بے احتیاج کی طرح اٹھ گیا

میرزا غالب، آہ! ایں چہ ضمود
در چنانہش شکایت است ضرور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب نے یہ کیا کر ڈالا
ان کی خدمت میں یہ گلہ لازمی ہے

میرزا غالب، آہ! مظہر فیض
بود پشماں کزد حضور و ظہور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب جو مظہرِ فیض تھے
سارا نورِ ظہور ان ہی کے دمِ قدم سے تھا

میرزا غالب، آہ! نرد نہ خود
با خودم تا مرا دریاں چہ تصور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب جب خود ہی مجھے
اپنے ہاتھ نہ لے گئے تو میرا کیا تصور

میرزا غالب، آہ! داشت چہا
با سروشان غیب ذوقِ ظہور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کو عالمِ غیب
کے فرشتوں سے ملنے کا کیا شوق تھا

میرزا غالب، آہ! آں کہ گئے
کم نہ دامنِ شمس من از غفور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کو میں نے
کبھی شاہِ چین سے کم نہیں جانا

میرزا غالب، آہ! آں کہ کنوں
خواہش خلق غالب، مغفور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ جن کو لوگ
اب مرحوم کہنے لگے ہیں

میرزا غالب، آہ! آں کہ بنور
روح خوانان او اثاث و ذکور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ جن کی اب
عورتیں اور مرد سب تعریف کرتے ہیں

میرزا غالب، آہ! آں کہ وفات
نہ بہ یک جا ہزار جا مذکور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ جن کی محبت کا
ایک نہیں ہزار جگہ خد جا ہے

میرزا غالب، آہ! آں کہ مرد
غم شد جملہ فہم و عقل و شعور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ جن پہ سارے
فہم و عقل و شعور تمام ہو مجھے

میرزا غالب، آہ! آں کہ ز من
ی شنیدے غزل پہ ذوق دہر

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ جو مجھ سے
بڑی ذوق و شوق سے غزل سنا کرتے تھے

میرزا غالب، آہ! آں کو را
نام از جان و دل وحش و طیور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ جن کے
تمام پرندے اور جانور تابعِ فرمان تھے

میرزا غالب، آہ! آں عاشق
کہ کہے کوہ کن برشِ مزدور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب ایسے عاشق
کہ کوہ کن کے ساتھ ساتھ مزدور بھی تھے

میرزا غالب، آہ! در فن شاعر
بود چوں بادشاه عشق دستور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ فن شاعری میں
بادشاہ اور میں ان کے وزیر کی طرح تھا

میرزا غالب، آہ! می تمہید
ہرچہ می بود در دلم مستور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ مجھ جانتے تھے
جو کچھ بھی میرے دل میں پنچا ہوتا

میرزا غالب، آہ! از نظرم
رفت چوں دور شد چہ اش مخدور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب میری نظر سے کس طرح
دور ہو گئے اور وہ کیا چاہتے تھے

میرزا غالب، آہ! نرد و بدل
شد چہ ماتم زمان را ہر سور

ترجمہ: آہا میرزا غالب انتقال کر گئے اور
زمانے کی شادمانی ماتم میں تبدیل ہو گئی

میرزا غالب، آہا سی ٹھیکہ
چہ قدر در پہ مرد بے مقدر

ترجمہ: آہا میرزا غالب جو کسی بے حیثیت
انسان کو بھی بے حساب در وے دیتے تھے

میرزا غالب، آہا سوئی بود
اعتقاد مرا و دلی طور

ترجمہ: آہا میرے اعتقاد کے مطابق تو میرزا غالب
سوئی تھے اور دلی کوو طور تھی

میرزا غالب، آہا آں کہ منم
سایہ او را و او سراپا نور

ترجمہ: آہا میرزا غالب سراپا نور اور
میں ان کے سایے کی مانند تھا

میرزا غالب، آہا چوں کوچید
شد بہ ملکِ سخن ہزار فتور

ترجمہ: آہا میرزا غالب جب کوچ کر گئے (۴)
سلطنت شاعری میں ہزاروں خرابیاں پیدا ہو گئیں

میرزا غالب، آہا نرد و مرا
ز آتشِ لطف سینہ رنگِ خود

ترجمہ: آہا میرزا غالب کا انتقال ہو گیا اور
اس دکھ کی آگ سے میرا سینہ رنگِ خود ہو رہا ہے

میرزا غالب، آہا کو کہ مرا ست
دوہِ روشن ہمہ شبِ دہجور

ترجمہ: آہا میرزا غالب کہاں گئے
کہ میرا دوہِ روشن کلیتہً اندھیری رات ہو گیا

میرزا غالب، آہا کے دام
کہ چہ از غمش دلِ معصوم

ترجمہ: آؤ! میرزا غالب کو کیا معلوم
کہ ان کے کیسے کیسے دکھ میرے دل پر مسلط ہیں

نقشہٴ مغموم ہی تو اس یزدن
تو چہ ایں لفظِ بودا مسرور

ترجمہ: نقشہ! بھلا تو اس لیے خوش کیوں تھا
البتہ مغموم ہوتا تو بہر حال جائز ہے

فخر مرکی و رجبِ غالبِ مُرد
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

ترجمہ: (مر) فخر مرکی و رجبِ غالب
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا ہے

داد چرخِ حکیمِ برباد
داد از دستِ ایں حکمِ داد

ترجمہ: اگرچہ چرخِ حکمِ مر نے مجھے برباد کر دیا
(یعنی) اس حکمِ مر کے ہاتھ ہی سے داد بھی دی

انچہ . از فوت میرزا غالب
ہر من افکار ہر کسے تہ فاد

ترجمہ: میرزا غالب کی موت سے جو افکار
مجھ پر پڑی ایسی کسی پر نہیں پڑی

نکتہ زائی دگر کھا اکٹوں
شد ز دہر آں کہ نکتہ ہا ی زاد

ترجمہ: اب نکتہ آفرینی کہاں اور کیوں کر (ہو)
کہ نکتہ آفرین ہی دنیا سے چلا گیا

سایہ برداشت از سرم ای دایے!
آں کہ مانجہ سرد بود آزاد

ترجمہ: ہائے میرے سر سے سایہ اٹھا لیا
اس نے جو سرد کی طرح آزاد تھا

او چو آباد کرد بخت را
من نہ باشم دریں خراب آباد

ترجمہ: اس نے تو جا کر جنت آباد کر لی
تو میں بھی اب اس خراب آباد (دنیا) میں نہیں رہوں گا

شادیم رشت بست و نکواں بود
نام شاد ہے میرے مکن ناشاد

ترجمہ: میری شادمانی نے رنج سزا باندھ لیا
لیکن وہ مجھ ناشاد سے شادمانی کے نام کو نہیں لے جاسکتی

گریم آں دم کہ در غمش خود ابر
نہ تواند بہ غمناک من استاد

ترجمہ: اس وقت مجھے (گور بھی) دلتا آتا ہے جب اس کے غم میں
میرے سامنے ابر بھی نہیں ظہر سکتا

خود سوے خللہ رشت عزم دوا
داد عمر مرا کسے کہ یہ بانہ

ترجمہ: جس نے میری زندگی برباد کر دی
اس نے خود گھوڑا جنت کی طرف دوڑا دیا

بہیں زمیں سخت، آسمان دور است
از کہ جویم میں این دنیاں اعدا

ترجمہ: زمین بہت سخت اور آسمان بہت دور ہے
اس وقت میں کسی سے مدد مانگوں

چہ دعاے جا کہ ی میم
زندگی جملہ فتنہ است و فساد

ترجمہ: میں تو مری رہا ہوں، اب زندگی کی دعا کیا کرنا
کہ زندگی سراسر فتنہ و فساد (ہی) ہے

آں کہ را بد عقل گل شاگرد
فتنہ را بد پس جہاں استاد

ترجمہ: جبرئیل تو اس کے شاگرد تھے
جب کہ فتنے کا استاد سارا عالم تھا

ہر گوش از ہے شیراز
ی زخم جام ہر چہ بانا باد

ترجمہ: شیراز کی روایت کے مطابق اس کی قبر پر
میں شراب پی رہا ہوں، ہر چہ پارا باد

سوے ملکِ عدم نہاد قدم
اسد اللہ خان پاک نہاد

ترجمہ: اسد اللہ خان پاک طہیت
ملکِ عدم کی طرف روانہ ہو گئے

حبِ عالم ہمیں مقامِ بود
اسی کہ گفتہ است پیش ازین استاد

ترجمہ: یقیناً میرے حبِ حال یہی مقام ہو گا
وہ جو اس سے پہلے ہی استاد کہہ گئے ہیں

دردِ دلم چوں نہ رہ کند اعدوہ
بدلم چوں نہ جاں کند فریاد

ترجمہ: غم میرے دل میں کیوں نہ رہ جائے
اور جان میرے ہونٹوں پر فریاد بن کر کیوں نہ آئے

فخرِ مرئی و رنجِ طالبِ نرد
اسد اللہ خاں غالبِ نرد

(ک) فخرِ مرئی و رنجِ طالبِ
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۸

من چہ گویم کہ حالِ دل چوں است
صبحِ معلوم و شامِ محزون است

کیا کہوں کہ دل کا کیا احوال ہے
صبحِ غمِ کین ہے اور شامِ المِ ناک

دشمنِ عرصہ کرد بر من تنگ
سردکارم کنوں یہ ہاسون است

میری دہشت نے مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے
اب میرا سردکار جنگلوں سے ہے

یہ کہیے دیکر چہ رنگِ منِ خواہ؟
کوئی آفاقِ جملہ کَلّوں است

ترجمہ: میرا گریہ میرا اور کون سا رنگ چاہتا ہے
چپ کر چلی ہے ساسی کائنات (کتاب کی موت کے سبب لکھا ہوا ہے)

غیر من کز خداش می خواہم
کیست آن کو ز مرگ ممنون است

ترجمہ: میرے علاوہ دوسرا کون خدا سے اس کا منتفی ہے
(میں ہی) موت کا ممنون ہوں

حال یک یک چه با کسے گویم
دل جدا د جگر جدا خون است

ترجمہ: ایک ایک کا حال کسی سے کیا کہوں
دل اپنی اور جگر اپنی جگہ خون ہو گیا ہے

ایں نہ دایم کدام مُرد ولے
صد تنہا ہے سینہ مدفون ست

ترجمہ: میں یہ کبھی نہیں پاتا کہ موت کس کو آئی
(میں تنہا رہا کہ کب تک تنہا نہیں میرے سینے میں مدفون ہو گئیں)

اسد اللہ خاں نہ آں کہ اذو
پچ صاحب غرض نہ ممتون است

ترجمہ: اسد اللہ خاں تو وہ شخص تھے کہ
ہر غرض مند ان کا احسان مند ہے

عقل عقل است مکتوف غائب
عقل کل ہم براں چہ مفتون است

ترجمہ: غائب کا کلام عقل کے سامنے ہے
اس پر تو جبرئیل بھی عاشق ہے

سرغوش رفتہ و ز رفتن او
جام کام زمانہ داژدون است

ترجمہ: غائب تو مت دم کو سدھارے لیکن ان کے
جانے سے دنیا کے مقصود کا پیالہ الٹا ہو گیا ہے

بعد مرگ دے از بھائش
عاقل آں مکی کہ بہود مجنون است

ترجمہ: اس کی موت کے بعد اس کے دوستوں
میں جو حائل تھا، وہ بھٹوں ہو گیا ہے

اُد کسی بے کساں چو بود اکٹوں
حال ما بے کساں دگر کون است

ترجمہ: بے کسوں کا وہی تو سہارا تھا لیکن اب
ہم بے کسوں کا حال چاہ ہو گیا ہے

کنہ از صدق اعتقاد امرود
ہر کہ قرش بیاں فریدون است

ترجمہ: متن واضح نہیں

از حد افزوں چو بود وہ ہر علم
صلحتش از بیان افزوں است

ترجمہ: وہ چوں کہ ہر علم میں حد سے زیادہ تھا
اس کی تعریف بھی بیان سے باہر ہے

میں نہ خواہم صبور ہے او نامد
ایں چہ افسانہ و چہ افسون است

ترجمہ: مجھے اس کے بغیر صبر نہیں آئے گا
یہ سانحات کا کیسا سر و ظلم ہے

فخر مرآی و رشک طالب فرد
اسد اللہ خاں غالب فرد

ترجمہ: (ک) فخر مرآی و رشک طالب
اسد اللہ خاں کا انتقال ہو گیا

۹

چند گویم کہ کوہ و کاو ایں جا ست
یعنی امداد از حد است زیاد

ترجمہ: کب تک جان کر دوں کہ راہ حیات میں بڑی مشکلات ہیں
یعنی حد سے زیادہ دکھ ہیں

ہو زین پیشی لکڑی حافظہ ام
غیرتیاں کنوں نہ دارم یاد

ترجمہ: ایک دمانے میں مرا حافظہ کیا حیرت انگیز تھا
اور اب سوائے فراموشی کے کچھ بھی یاد نہیں

اے کہ حلقی فراشت نہ کشم
رفت و یک رقد نیز نفرستاو

ترجمہ: تم تو کہتے تھے کہ تجھے نہیں بھولوں گا
اب مجھے ہو تو ایک رقد بھی نہیں بھیجا

کام دل فرد بر سر نعلین
می روم لوح می کشم فریاد

ترجمہ: مقصد دل فوت ہو گیا ہے
اب میں جاتا ہوں اور اس کی لاش پر لوح خوانی کرتا ہوں

ی کشم رنج و ی روم از خویش
ی دلم داد و ی کشم فریاد

ترجمہ: دکھ برداشت کرتا ہوں اور اپنے دوش گنوا بیٹھتا ہوں
چھٹیں مارتا ہوں اور فریاد کرتا ہوں

کس چہاں چہاں ہر ازہی ہر
وہر سٹاک و آساں بے داو

ترجمہ: کوئی کس طرح ان دو سے اپنی جان بچائے
زمانہ ظالم ہے اور آساں بے انصاف

چوں بخود ہر آساں بھم
یاد آہ از و چہ لفظ و داد

ترجمہ: اپنے اوپر جب آساں کے ان مظالم پر نظر ڈالوں
تو مجھے اس کی دوستی کے کیسے کیسے مزے یاد آ جاتے ہیں

کاش من ہم یہ او شتاب رسم
نہست نہ فہم، غیر ازہی اوراد

ترجمہ: میں بھی کاش! اس سے جلدی ہی جا ملوں
ان ونگائف سے زیادہ عقل کی اور کوئی بات نہیں

بچی انجام آں، ہر آں چہ خود
آہ من سرمر است و جسم رتاد

ترجمہ: جو کچھ بھی ہو ، انجام ضرور ظاہر ہو گا
میری آہ آدمی ہے اور جسم خاکستر

آں سے چاروہ چر خشک تمام
سہ عدد بود زاکہ از ہفتاد

ترجمہ: وہ چودھویں کا چاند جب تمام ہوا
تو تھڑ سال کا تھا

من پہ سے خانہ با بجا آرم
رشدم کردہ بود ہر چہ رشاد

ترجمہ: اب میں سے خانوں میں وہ احکام بجا لاتا ہوں
اس نے مجھے جس راہ راست کی ہدایت کی تھی

یعنی آں ساغیں بکف حافظ
منصب غرضتیں بہ غالب داد

ترجمہ: یعنی اس جام شراب بکف حافظ شیرازی نے
اپنا منصب غالب کو تحویل کر دیا

ی رسد گر چیں دعا نکم
اسد اللہ خاں پہ جلد رسد

ترجمہ: یہ دعا، اُمید ہے، قبول ہو گی
کہ خدا اسد اللہ خاں غالب کو جلد نصیب فرمائے

نو عربی سخن جوازست بنور
پہ سفر زود کی رود داماد

ترجمہ: عربی سخن ابھی جوان ہے
اور دلہا جلد ہی سفر پر جا رہا ہے

فخر عرقی و رکھو طالب نرد
اسد اللہ خاں غالب نرد

ترجمہ: (کہ) فخر عرقی و رکھو طالب
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۱۰

چیز دیکھ دوون دل چہ بود
دود دل آم شمار بیرون است

ترجمہ: دل میں دوسری کیا چیز ہو گی
میرا درد دل اندازے سے زائد ہے

کثرتِ گریہ یا ستم چہ عیاں
خود توان دیدہ دیدہ جیون است

ترجمہ: کثرتِ زاری کا کیا عیاں ہو
نظر آ رہا ہے کہ آنکھیں دریاے آسوی طرح بہ رہی ہیں

دیدہ شاید پیش ازیں کے ہو
عالمِ اتر پٹان کہ اکون است

ترجمہ: اس سے پہلے تم نے کیا دیکھا ہو گا
اب جو اتری دنیا میں ہے

عصم آسا شمع چہ بود جاں
ایں ہمہ لختِ عصم گردون ست

ترجمہ: میرے آرام ہی کا تو وہ دشمن تھا
ہر لمحہ آسمان میرا دشمن ہے

ایں کہ ہندو ذہیت را بر من
طرف مضمون کذب مضمون ست

ترجمہ: وہ مجھے ہندوؤں میں شامل کرتے ہیں
یہ ایک عجیب جتنی بے دروغ مضمون ہے

آں حوزیم کہ "تا" ابو گویم
روزیم حادزا مع القون ست

ترجمہ: متن واضح نہیں

چوں نہ میرے مردم دان
لقب گردوں بہ مردم دون ست

ترجمہ: عقل مند کیوں نہ مری
کہ آسمان کی صہبائی (صرف) کہنوں پر ہے

ہر کش دیدہ باچاں حکمت
گفت ہے شہد ایں لاطون ست

ترجمہ: جو کوئی بھی اس کی کثرتِ حکمت کو دیکھتا
تو یہی کہتا کہ (یہ) یقیناً افلاطون ہے

تونیاں خود گواہ ہیں اس سخنِ اند
شہرتِ اُردو ہند تا تونِ ست

ترجمہ: تون کے رہنے والے خود اس بات کے گواہ ہیں
کہ اس کی شہرتِ ہند سے تون تک پہنچ گئی

چہرہ آں کہ داشت از اکسوں
کشف ہم کوں ز اکسوں ست

ترجمہ: وہ جو کیڑے کے پھول کا چہرہ پہنتا تھا
آج اس کا وعدہ بھی اتنا ہی ناپائیدار ہو گیا

بود غالبِ ہاں محیطِ کمال
کشِ یکے نقطہ وِ کثرتِ ست

ترجمہ: غالبِ یقیناً وہی دائرۂ کمال تھا
کہ جس کا ایک ایک نقطہ بھی چمکا ہوا موتی تھا

ذیت است آں کہ بعدِ نردن او
چہ قدر ہا ز خویش مطعون ست

ترجمہ: اب بھی زندگی اس کی موت کے بعد
اپنے پر کیسی ملامت بھیج رہی ہے۔

ہا چہ گویم کہ چوں وہ او را
بہ چہاں قادرے کہ ہے چوں ست

ترجمہ: میں کیا کہوں کہ اس قدرت والے کا کون
جائزین ہو گا کہ جس کا کوئی مثیل ہی نہیں

لفظ و معنی نہ چوں یہ پوشند
در غم غالب ایں چہ مضمون ست

ترجمہ: شعر کا کیا مضمون ذہن میں آیا غالب
کے غم میں لفظ و معنی سیاہ پوش کیوں نہ ہوں

ہر خط ی ستودش زیں پیش
نقدِ بر لبِ ہینم اکنون ست

ترجمہ: اس سے ہمیشہ بھی ہر طرح میں ہی کی توصیف کرتا تھا
اور تفتہ! اس وقت بھی میرے لب پر یہی ہے

فخر عرقی و رقبہ طالب نرد
اسد اللہ خاں عاتب نرد

ترجمہ: (کہ) فخر عرقی و رقبہ طالب
اسد اللہ خاں عاتب کا انتقال ہو گیا

۱۱

منم و از اجل شکایت با
دگر از دین حق نجات با

ترجمہ: میں ہوں اور موت سے کچھ شکوے
دوسرے: زندگی سے شرمندہ گیاں

آہ زیں رنج با و محنت با
واہ ازیں تفتہ با و آفت با

ترجمہ: فریاد ان غموں اور دکھوں سے
دہائی ان شرور و مصائب سے

مشت مسکوں عالم ناگاہ
عافیت ہائے سن مصیبت ہا

ترجمہ: ایک دم میری قسمت ہی پلٹ گئی
اور میرا سکھ بھین مصائب میں بدل گیا

میرزا غالب آں کہ از دہلی
نام او رفتہ در ولایت ہا

ترجمہ: وہ میرزا غالب کہ جن کا نام دہلی سے
مکوں مکوں پہنچ گیا ہے

خود بہ جنت رسید و کرد عطا
بوضع و شریف کلفت ہا

ترجمہ: خود تو جنت پہنچ گئے لیکن
وضع دار و اشراف کو مصائب عطا کر گئے

وہ چہ غالب یہ ہر یکے غالب
روزی او ز غیب نصرت ہا

ترجمہ: واہ غائب اور کیا غائب کہ ہر ایک پر چھا جاتا تھا
اور نصیب سے اس کے نصیب میں تسخیرات تھیں

اسد اللہ خاں کہ نام دے است
تا چھا شیر کوہ سخت ہا

ترجمہ: اسد اللہ خاں اس کا نام ہے
اے شیر کوہ! تجھے کیسے رعب داب نصیب ہیں

چہ قصائد، چہ مثنوی، چہ غزل
مرئی از دے کھنڈ خجالت ہا

ترجمہ: کیا قصیدہ، کیا مثنوی اور کیا غزل
ہر شے میں مرئی کو بھی اس سے خجالت ہی ہوتی تھی

لطف طبعش چہ ہیں کہ در ہر شعر
نہ لطافت کیے لطافت ہا

ترجمہ: اس کے لطف طبع پر نظر ڈالو تو ہر شعر میں
ایک نہیں سیکڑوں خوبیاں نظر آئیں گی

چوں نہ دانندش افسح انصحا
بندگانی ورش فصاحت با

ترجمہ: لوگ اس کو فصیحوں کا فصیح کیوں نہ جانیں
جب اس کے دروازے کے تمام بھی جسم فصاحت ہیں

چوں نہ خوانندش ابلغ اہلغا
کم نہ سخبان در بلاغت با

ترجمہ: لوگ اس کو بلیغوں کا بلیغ کیوں نہ کہیں
کہ وہ بلاغت میں (مشہور عرب خطیب) سخبان سے کم نہیں تھا

لفظ و در لفظ آں معانی پاک
شعر و در شعر آں نزاکت با

ترجمہ: اس کا لفظ (کا انتخاب) اور پھر لفظ میں معانی کی خوبی
اس کا (سانچے میں اُحلا ہوا) شعر اور پھر شعر میں نزاکتیں

عشق او ز عالم دیگر
ہم مجاز اندرش حقیقت با

ترجمہ: اس کا شعر عالم بالا کی چیز ہے
کہ ہزار کے اندر بھی حقیقت کی جلوہ گری ہوتی ہے

شور ہر شو، از لذت شعروش
نمکِ خوان او طاحت ہا

ترجمہ: اس کے شعروں کی لذت کا دنیا میں جہ پا ہے
اور اس دسرخوان کے نمک میں کیسے کیسے مرے ہیں

از طراقت چہ گویت چہ نہاد
چہ ظریفان دہر منت ہا

ترجمہ: اور اس کی طراقت کے بارے میں کیا کہوں کہ اس نے
ظریفانِ زمانہ پر کیسے کیسے احسانات کیے ہیں

حسنِ خلقش چنان کزد می دید
کینہ در مرد ہم محبت ہا

ترجمہ: اس کی خوش اخلاقی ایسی تھی کہ
کینہ پرور انسان بھی (اصول) محبت کا قائل ہو جاتا تھا

آں قدر ہا کہ واقف از ہر فن
آن قدر آگہ از طریقت ہا

ترجمہ: اس کی قدرت علم اتنی تھی کہ وہ ہر فن سے واقف تھا
اور اسی قدر آگاہی اس کی مختلف مذاہب طریقت میں تھی

ایں کہ گوید کہ رو مشرب ہو
می ترا دید از و کرامت ہا

ترجمہ: لوگ (اس کی تعظیم کے طور پر) کہتے ہیں کہ وہ روئے مشرب تھا
کرامات (قو) اس سے چمکی پڑتی تھیں

از مرآت نشان نہ مانم اکنون
یارب او مُرد یا مرآت ہا

ترجمہ: اب مرآت کا نشان دنیا سے مٹ گیا
اے خدا وہ مرا یا مرآت و محبت فنا ہو گئے

صحت او کسے کہ یک دم یافت
و اندیش دل چہ یافت دولت ہا

ترجمہ: ایک لمحے کو جس شخص کو اس کی صحبت ملتی
اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کو کیسے خزانے مل گئے

اُو خداوندِ من ز چندیں سال
من تا خزانِ اُو ز مدتِ با

ترجمہ: کتنے عرصے سے وہ میرا آقا تھا
اور میں مدتوں سے اس کا مدح سرا (ہوں)

درمن و اُو ہ یاریِ عظیم
تا چہل سال ماندِ صحبتِ با

ترجمہ: کہ میرے اور اس کے درمیان
کہ چالیس سال صحبت رہی

وگر ایسا نا بیاں چہ سود کہ باز
ماند با ہم وگر چہ الفتِ با

ترجمہ: اور اس عرصے میں یہ بیان کرنا
کہ ہمارے درمیان کیسی محبتیں تھیں، بے فائدہ ہے

چہ نکویم چہ یاتم از دے
یہ دل صاف و صدق نیت ہا

ترجمہ: اب کیا تاؤں کہ مجھے اس سے صدق دلی اور نیک نیتی
کی کیسی دولت نصیب ہوئی

کردے قصد نزد گر گاہے
چہ نمودے یہ من نصیحت ہا

ترجمہ: اگر بھی میں تائب (شراب) ہونے کا قصد کرتا
تو وہ مجھے کیسی کیسی نصیحتیں فرماتے

چوں نہ خواند خلق مخدوم
کردش چند سال خدمت ہا

ترجمہ: لوگ اس کو میرا مخدوم کیوں نہ کہیں
میں نے کتنے سال اس کی خدمت کی ہے

جوہ ہا بنم این زمان از سپہ
یادم آں سر ہا و شفقت ہا

ترجمہ: آج جو آسمان کے یہ ستم مجھ پر ہو رہے ہیں
تو مجھے اس کی بھبتیں اور شفقتیں یاد آتی ہیں

اے کہ پری گزشت پر تو چہا
نہ ای آ کہ ازیں حقیقت ہا

ترجمہ: اے طالب! تو جو مجھ سے میرا احوال پوچھتا ہے
تو کیا تجھے ان حقائق سے آگاہی نہیں

فخر مرثی و رجبہ طالب مُرد
اسد اللہ خاں غالب مُرد

ترجمہ: (کہ) فخر مرثی و رجبہ طالب
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۱۲

ہائے! آں سرو نامدار چہ شد
ہائے! آں فکرِ روزگار چہ شد

ترجمہ: ہائے! وہ نام و رکھاں چلا گیا
ہائے! وہ کہ باعثِ فکرِ زمانہ تھا، کہاں چلا گیا

تاچہ سرسبز باغ و رنگیں گل
ہائے! آں خوش نوا ہزار چہ شد

ترجمہ: باغ کی طراوت و پھولوں کی رنگینی کس واسطے ہے
ہائے! وہ خوش الحان لیل کہاں چلا گیا

اقتدار است ایں زماں ہمہ خوار
ہائے! آں صاحبِ اقتدار چہ شد

ترجمہ: لفظِ اقتدار کی عزت اٹھ گئی
ہائے! وہ صاحبِ اقتدار کہاں چلا گیا

مگریم و پریم از کنارہ کشاں
ہائے! آں بحرِ بے کنار چہ شد

ترجمہ: میں روتا ہوں اور کفارہ کشوں سے پوچھتا ہوں
کہ وہ بکھرے کفار کہاں گیا

کام گارے بہر درست گدا
ہے! آں شاہ کامگار چہ شد

ترجمہ: ہر کامیاب شخص اب گدا نظر آتا ہے
ہے! وہ شاہ کامیاب کہاں چلا گیا

مشت خود سانحہ درمی ایام
ہے! آں سانحہ نگار چہ شد

ترجمہ: وہ بذات خود ان دنوں سانحہ بن گیا
افسوس! وہ سانحہ نگار کہاں چلا گیا

جا پدھیم خسرواں می داشت
ہے! آں در شاہوار چہ شد

ترجمہ: وہ جو بادشاہوں کے تاج کے شایان شان تھا
ہے! وہ در شاہوار کہاں چلا گیا

یکہ اکٹوں پناہ خواہم جست
ہائے آں آئیں حصار چہ شد

ترجمہ: میں تجھا اب (اپنے لیے) پناہ خواہم دوستوں کا
ہائے اوہ جو (میرے لیے) فولاد کا قلعہ تھا، کہاں چلا گیا

دیدن خاک زخمیں ستم ست
ہائے آں قصر زرنگار چہ شد

ترجمہ: اس کی قبر کی مٹی دیکھنی ستم ہے
ہائے! وہ جو زرنگار قلعہ تھا، کہاں چلا گیا

گفتہ بود ایں، خودم زیم صد سال
ہائے آں عہد استوار چہ شد

ترجمہ: خود ہی تو اس نے کہا تھا میں سو سال زندہ رہوں گا
ہائے! وہ پکا وعدہ کہاں چلا گیا

میرزا غالب آں کہ ہے کم و کیف
ہند را بود افکار چہ شد

ترجمہ: وہ میرزا جو بے کم و کاست
فخر ہندوستان تھا، کہاں چلا گیا

شدن او تو دہر دارم ساخت
وہیں نہ رانم دل تزار چہ شد

ترجمہ: اس کی موت نے مجھے خوار کر دیا
اور اب مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ دل ناتواں کا کیا ہوا

بود معصوم ازیں دیار سخن
میں کہ بے او دریں دیار چہ شد

ترجمہ: اُس سے دیار سخن آباد تھا
اس کے بغیر، دیکھو! اس شہر کا کیا حال ہو گیا

آں کہ بود از چشم نفور چہ شد
وہاں کہ از فخر داشت عار چہ شد

ترجمہ: وہ شخص، جسے صودہ شان و شوکت سے نفرت تھی، کہاں چلا گیا
وہ شخص کہ جس کو تکبر نے عار آتی تھی، کہاں چلا گیا

نالہ زمیں میں کشیدہ غم عیث است
گر کشیدہ غم ہزار بار چہ شد

ترجمہ: اس کے بعد آہ و زاری کرنا بے سود ہے
اور اگر ہزار بار کی بھی تو کیا حاصل ہوا

دل و چہرے میں الم چہ واقع گفت
من و اندوہ ہے شمار چہ شد

ترجمہ: ایک دل اور اسے (بہت سے) غم تو آخر کیا حال ہوا
ایک میں اور اسے سارے دکھ، کیا حال ہوا

گر اجل گفت زود ی ایم
حاصلم غیر از انتظار چہ شد

ترجمہ: اگرچہ موت نے کہا تھا کہ جلد ہی آؤں گی
لیکن مجھے تو سوائے انتظار کے اور کچھ حاصل نہ ہوا

انچہ ہمال ی شود پیدا
چہ دم شرح آنکہ پار چہ شد

ترجمہ: اس سال جو ہو رہا ہے وہ ظاہر ہے
پار سال کیا ہوا اس کا کیا بیان کروں

داسنے کو کہ گیرش یک بار
درغش گر شوم غبار چہ شد

ترجمہ: وہ دامن کہاں ہے کہ اس کو کوئی ایک بار پکڑ لے
اگر میں اس کے ظم میں غبار ہوا بھی تو کیا فائدہ

وہ ہلاک خودم کنوں مجبور
داشتم ہرچہ اختیار چہ شد

ترجمہ: آج میں اپنی جان لینے پر مجبور ہوں
کبھی جو ہر چیز پر مجھے اختیار تھا، کہاں چلا گیا

اں گرہاں کہ داشتم سالم
چہ شد آہ تار تار چہ شد

ترجمہ: میرا گرہاں تو صحیح سالم تھا
ایسا کیا واقعہ ہوا کہ تار تار ہو گیا

ایسی پہریں اے فلاں کہ در غم او
چہ اہل چوں شدم دوچار چہ شد

ترجمہ: اے مخاطب! نہ پوچھ کہ اس کے غم میں
جب میں اہل سے دوچار ہوا تو کیا غش آیا

شد بسر جملہ در غمے کہ پہریں
حاصل از عمر مستعار چہ شد

ترجمہ: ایک ناقابل بیان غم میں ساری زندگی بسر ہو گئی
اور اس عمر مستعار سے حاصل کچھ بھی نہ ہوا

بود صبر و قرار مونس من
صبر آوارہ شد، قرار چہ شد

ترجمہ: صبر و کھلیب ہی میرے رفیق تھے
صبر آوارہ ہو گیا اور قرار کہیں کھو گیا

آں کہ ہر دم چہ مستی ہے سرشار
بود آں کہ نہ ہوشیار چہ شد

ترجمہ: وہ کہ ہر لمحے ایک گونہ مستی میں سرشار ہونے کے باوجود
اس قدم بیدار رہتا تھا، کہاں چلا گیا

آں کہ از فرط سینہ صافی ہا
ہم باغیار بود یار چہ شد

ترجمہ: وہ شخص کہ اپنے صفائے قلب کی کثرت سے
اغیار کا بھی دوست تھا، کہاں چلا گیا

آں کہ ما صور حشر بود ظلم
حشر بربا سر مزار چہ شد

ترجمہ: جس کے لیے صور حشر اس کا ظلم تھا
اس کے سر مزار حشر کا بربا ہونا فضول ہے

مرگ چوں شد دوچار او دیدی
ہو کن و نیست کارزار چہ شد

ترجمہ: جب موت اس سے دوچار ہوئی تو تو نے دیکھا
کہ بھری اور زندگی کی کیسی جنگ ہوئی

اے کہ پری چہ شدہ نمی بقی
برہم ایسا لکھ جملہ کار چہ شدہ

ترجمہ: تو جو پوچھتا ہے تو کیا تجھے نظر نہیں آتا
کہ اس وقت یہ سارا کاروبار حیات کس طرح چاہا ہو گیا

فخر مرقی و رجب طالب نرود
اسد اللہ خاں غالب نرود

ترجمہ: (ک) فخر مرقی و رجب طالب
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۱۳

چہ بخ پیداو کر چہ باہ کرود
دہر نرود و شر چہ باہ کرود

ترجمہ: (اگر) فلک نا انصاف ہے کیا کیا جائے
(اگر) زمانہ شر و فساد سے بڑا ہے تو کیا کیا جائے

حال من شد بتر چہ باہ کرود
حال دل ہم دگر چہ باہ کرود

ترجمہ: میرا حال بدتر ہو گیا تو کیا کیا جائے
اور دل کا حال بدہم ہے تو کیا کیا جائے

قصہ درد من دراز ہے ست
دوستاں مختصر چہ پایہ کرد

ترجمہ: میری داستانِ غم بہت طویل ہے
اے دوستو! اس کو مختصر کیا کیا جائے

ایں صدا خیزد از دلم کہ نکست
کوہ اندوہ کمر چہ پایہ کرد

ترجمہ: میرے دل سے آواز آ رہی ہے
کہ غم کے پہاڑ نے میری کمر توڑ دی، کیا کیا جائے

در حلاش دوا چہ پایہ نمرود
چارہ درد سر چہ پایہ کرد

دوا کی حلاش میں مر جانے سے کیا حاصل
درد سر کا علاج کیا کیا جائے

ہم چاک ست دل چہ باہ کنت
ہم خون شد جگر چہ باہ کرد

ترجمہ: سارا دل چاک چاک ہے، کیا کیا جائے
سارا جگر غوم غوم ہو گیا، کیا کیا جائے

نرد شعر و سخن چہ باہ خواند
رفت علم و سخن چہ باہ کرد

ترجمہ: شعر و سخن کو موت آگئی، (اب) پڑھنے کو کچھ نہ رہا
علم و سخن دنیا سے اٹھ گئے، کیا کیا جائے

نام نام آوری چہ باہ نرد
نرد آں نامور چہ باہ کرد

ترجمہ: اب نام نام دری کیا لیا جائے
کہ جب وہ نام و رقی مر گیا، کیا کیا جائے

روے امن و امان چہ باہ دید
من و ضعف بصر چہ باہ کرد

ترجمہ: اب امن و امان کی صورت کیا دیکھتی
(ہائے!) میں اور میری بھارت کی یہ کم زوری، کیا کیا جائے

دام از حد فزوں چه باید زیست
عمر آمد بسر چه باید کرد

ترجمہ: دام (آئندہ) حد سے زائد ہے، (اب) زندہ رہنا فضول ہے
میری عمر بھی اب انجانا کو پہنچ گئی، کیا کیا جائے

منعم از گریہ، آب مست
دیدہ ہر لعل تر چه باید کرد

ترجمہ: متن واضح نہیں
ہر لعل آنکھیں کیوں تر دکھی جائیں

پنبہ زار مرا رسید از غیب
خوابے شرر، چه باید کرد

ترجمہ: میرے پنبہ زار کو غیب سے
چنگاریوں کی خوش خبریاں پہنچ چکی ہیں، کیا کیا جائے

من دکان چیدہ بوم از چے نفع
نفع من شد ضرر چه باید کرد

ترجمہ: میں نے تو نفع کے لیے دوکان کھولی تھی
میرا نفع نقصان بن گیا، کیا کیا جائے

من ہے گشت بوم از چے امن
امن من شد خطر چه باید کرد

ترجمہ: میں تو سکون کی تلاش میں بہت سرگرداں رہا تھا
میری (تلاش) سکون ہی خطرہ بن گئی، کیا کیا جائے

گریہ ام کرد انچه کردہ دگر
دو سوے بام و در چه باید کرد

ترجمہ: میری آہ و زاری نے جو کرنا تھا کر دیا
اب بام و در کی طرف رخ کرنا بے معنی ہے

مردنش حیر دو بہ دل کوئی
دشمن دل کارگر چه باید کرد

ترجمہ: اس کی موت نے گویا دل پر حیر مار دیا
اب بھلا زخمِ دل کو پاؤں کیا کیا جائے

دردِ چشیں حالِ مگر بلا آید
چشمِ از دے حذر چہ باید کرو

ترجمہ: ان حالات میں اگر کوئی آفت
مجھے پیش ہو تو اس سے بچنا فضول ہے

مگر کچے رخت و دیکھے آید
دردِ از دل بدر چہ باید کرو

ترجمہ: اگر ایک گیا اور دوسرا آ گیا
تو اخراجِ دردِ دل فضول ہے

جرح و ایں سایہِ جودِ ناچارم
نالہ شد ہے اثر چہ باید کرو

ترجمہ: مجھ ہے بس پر آسمان کے اس کھڑت سے حتم (ہیں)
میرا رونا چیتا ہے اثر ہو چکا ہے، کیا کروں

اے کہ گوئی دے مرد از غولیں
نیمت مبر ای قدر چہ باہ کرد

ترجمہ: تو جو کہتا ہے کہ ذرا ہوش سنبھالو!
(تو بچی بات یہ ہے کہ) مجھ میں اب مبر باقی نہیں کیا کیا جائے

مرغ دل را فلک چہ دور اما
ریخت دقت اگر چہ باہ کرد

ترجمہ: یوں تو مرغ دل کے لیے آسمان بہت دور نہیں
لیکن اگر آسمان ہی گر جائے تو کیا کیا جائے

خاک شد خاک میرزا غالب
غیر خاش چہ سر چہ باہ کرد

ترجمہ: میرزا غالب تو مر کے مٹی ہو گئے
اب ان کی خاک کے سوا اور سر پر کیا ڈالا جائے

ہر کہ رقص باز کے آید
میر ہم گونہ گر چہ باہ کرد

ترجمہ: ہر وہ شخص جو گیا تو واپس کب آتا ہے
یک کونہ مبر سے (بھی) کیا فائدہ

آں کہ جز در حضر تمامہ کجے
کرد ازیں جا سفر چہ پایہ کرد

ترجمہ: وہ کہ ہمیشہ موجود رہتا تھا، اب جو
وہ سفر پر روانہ ہو گیا تو کیا کیا جائے

آں کہ سن داشتہم از و چشمے
چوں گلند از نظر، چہ پایہ کرد

ترجمہ: اس شخص ہی نے، جس سے امیدیں تھیں
مجھے اپنی نظر سے گرا دیا تو اس کا کیا علاج

عالم اینا او بخواب خوش در گور
بے خبر را خبر چہ پایہ کرد

ترجمہ: (ہمارا) یہ حال ہے اور وہ میٹھی نیند سو رہا ہے
اب بے خبر کو باخبر کیا کرنا

دیم آخر ہر آں چہ غیش آمد
ہر قضا و قدر چہ باید کرد

ترجمہ: جو کچھ بھی مجھ پر پڑی، میں نے برداشت کی
مشیت الہی کا کیا علاج ہے

تیرہ دہلی چراغ دہلی کو
سوے دہلی گزر چہ باید کرد

ترجمہ: چراغ دہلی بجھ گیا اور دہلی تاریک ہو گئی
اب دہلی کی طرف جانا ہی بے معنی ہے

چند کوئی تو و لقاں تا کچھ
نقدِ خاموش! دگر چہ باید کرد

ترجمہ: تو کب تک اپنی داستانِ غم سنائے گا اور آہ و فغاں کرے گا
نقدِ خاموش ہو جا! اب اس کے علاوہ اور کیا کیا جاسکتا ہے

خبر مرثی و رجبِ طالبِ مُرد
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

ترجمہ: (ک) غر مری و رجب غائب
اسد اللہ خاں غائب کا انتقال ہو گیا

۱۳

اے خوش اور خوش فضیلت اور
نرد اما نہ نرد شہرت اور

ترجمہ: کیا کہنے اس کے اور اس کی فضیلت کے
کہ خود مر گیا لیکن اس کی شہرت نہ مٹی

خواجہ خود را مصاحب جبریل
ہر کرا شد نصیب صحبت اور

ترجمہ: جس کسی کو اس کی صحبت نصیب ہوئی
وہ اپنے آپ کو جبریل کا مصاحب کہنے لگا

آں کلائی کہ بود از سمجہ
حج احمدیست از فراست اور

ترجمہ: سمجہ کا رہنے والا جو کلائی تھا
اس کا اندوختہ بھی اسی کی دانیش سے کیا ہوا تھا

یہاں آگے است ازیں کہ چہ کرد
یہ نصیرا کواے نصرت او

ترجمہ: متن واضح نہیں

شد ولی ہر کہ دید دیوانش
از کلاش عیاں کرامت او

ترجمہ: جس نے اس کا دیوان پڑھا، خود ولی ہو گیا
اس کے کلام سے اس کی کرامت ظاہر ہوتی تھی

ہاں ہیں کلیات او کہ وہ آں
قدرت او عیاں نہ قدرت او

ترجمہ: اس کے کلیات کو دیکھو تو
اس کی قدرت (کلام) اس کی قدرت سے ظاہر ہوتی ہے

رفعت او ز آساں برتر
آساں را حسد نہ رفعت او

ترجمہ: اس کی بلندی آسمان سے بھی زیادہ تھی
اسی لیے آسمان اس سے اس کی بلندی پر حسد کرتا تھا

پارسا بود خواہ، خواہی رند
من بجاں تیرو طریقہ او

ترجمہ: چاہے وہ پارسا تھا، چاہے رند
میں بہر حال جان و دل سے اس کا ہیرو طریقہ تھا

کو نومد ہے کم ست بنور
کو دھیر دھیر و مدحت او

ترجمہ: مشکل ہی سے کوئی ملے گا کہ لکھ سکے
کہاں مثنوی فلک اور کہاں اس کی مدح

کو نکھائی ست پہلوانِ سخن
دیدہ باد چہ نظم طاقت او

ترجمہ: اگرچہ نکھائی پہلوانِ سخن ہے
لیکن اس کی طاقت سخن درہی بھی عملِ نظر ہے

حامیاں زو زیاد تر صحتوں
نہ بہ خاصاں ہمیں مرڈستہ او

ترجمہ: عوام اس کے زیادہ احسان مند تھے
اس کا تعلق خاطر صرف خواص سے نہیں تھا۔

اسد اللہ خود دلی از دل
بہ علی پیشتر محبت او

ترجمہ: اسد اللہ (خاں) خود دلی تھے
(اور) حضرت علیؑ سے انہیں زیادہ محبت تھی

شکر نصیحت چساں نہ کسم
نہ شنیدم ز کس شکایت او

ترجمہ: اس کی شعر خوانی کا شکر کیوں نہ کروں
کہ میں نے کسی شخص سے اس کی شکایت نہیں سنی

پیش من اعتقاد من راز
طاعت حق بود اطاعت او

ترجمہ: میرا اعتقاد اپنی جگہ پختہ ہے
میں اس کی اطاعت کو اطاعت حق سمجھتا ہوں

مکملش ہوو طاعت می ماند
ہر کہ در سایہ عنایت او

ترجمہ: متن واضح نہیں

وگر اندر بہشت جائے یافت
روز محشر ہم از شفاعت او

ترجمہ: بہشت میں دوسروں کو بھی
اس ہی کی سفارش پر جام (شرابِ طہور) ملا

ہم خدا ہم رسول ازو راضی
تا کہ خوش دین او و ملت او

ترجمہ: خدا اور رسول دونوں اس سے راضی ہیں
چوں کہ دین و ملت بھی اس سے خوش ہیں

کہنے توڑی یہ دشمن اورانی
مہرورزی مطلق عادت او

ترجمہ: کہنے پروری دشمن ہی کو نصیب ہو
کہ خلق خدا سے محبت اس کی عادت تھی

یا دگر کس کہا، معاذ اللہ!
بود از نفس خود عداوت او

ترجمہ: نفوذ باللہ! کسی دوسرے سے کہاں
اس کی دشمنی تو اپنے نفس ہی سے تھی

آسمان پر زمین چھا نہ لگاؤ
چہ بلا بود وقت رحلت او

ترجمہ: بھلا آسمان زمین پر کیوں نہ گر پڑا
کیا بلا تھی جو اس کی وفات پر نازل ہو گئی تھی

بسلامت سلام من کاں خود
بود واپس سلامت او

ترجمہ: یہ ہم خیریت میرا سلام (پہنچے) کہ وہ خود
اپنی سلامتی سے وابستہ تھا

پیش ازیں ہم رواست مگر کویم
کم نہ از وصل مرگ فرقت او

ترجمہ: اس سے پہلے بھی یہ کہتا جائز ہے
کہ اس کی فرقت موت کے برابر ہے

ہادم بود در بلاغت و شعر
یادم آجہ چہا ہدایت او

ترجمہ: فن بلاغت و شعر میں وہ میرا رہ نما تھا
مجھے اس کی کیا کیا ہدایات یاد آتی ہیں

ہمن کم سواد و کم مایہ
بود از حد زیادہ شفقت او

ترجمہ: مجھے کم علم و کم حیثیت شخص پر
وہ انتہائی شفقت کرتا تھا

داشے از دُورِ مہم یاد
انجمن بود یا سرِ خلوتِ اُد

ترجمہ: وہ مجھے اتنا سے محبت سے یاد رکھتا
انجمن ہوتی یا خلوت

از من اکسوں قلمِ ملکِ سخن
خسروی یا قلمِ بدولتِ اُد

ترجمہ: آج قلمِ ملکِ سخن میرے زیرِ نگین ہے
لیکن یہ بادشاہت مجھے اس کی بدولت ملی ہے

نہ از سائلِ درِ بخ تا چاش
جانِ حاتمِ فدائے ہستِ اُد

ترجمہ: سائل سے کبھی اپنی جان بھی نہ بچا کر رکھتا
اس کی ہست پر جانِ حاتم بھی قربان کی جائے تو درست ہے

ایں گویا کافِ شہِ طالع لے
سودم تکتہ یادِ طلعتِ اُد

ترجمہ: یہ نہ کہہ کہ روشنی آفتاب ہر گوار ہو گیا
اے وقت! مجھے اس کی روشنی کی یاد دلگا رہی ہے

فرض انکوں پر اسی چہ حرف کہ خود
چوں نہ میرم و درد فرقتہ او

ترجمہ: الفرض فی الوقت سوائے اس کے کہ میں اس کی
جدائی میں کیوں نہ مر جاؤں، کیا کیوں

فخر عرقی و رجب طاب فرد
اسد اللہ خاں غالب فرد

ترجمہ: (ک) فخر عرقی و رجب طاب
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۱۵

غیر از می تاچہ چہ او را باد
جملہ اشیا و جملہ اسما باد

ترجمہ: اب اس کے علاوہ اس کو کیا دعا دی جائے
کہ دنیا کے سلسلے (اتھمے نامور بھی ہیں) اس کے نام ہو جائیں

خونِ اُردو ہے عرشِ اعلا باد
از لب اُردو چل مسیحا باد

ترجمہ: اس کی شاعری کا چرچا عرشِ معلیٰ پہ ہو
اور مسیحا بھی اس کے افقاس سے شرمندہ ہو جائے

رفت غالبِ مگر از جہاں من ہم
ردم از خولیش ہر چہ بادا باد

ترجمہ: غالبِ دنیا سے چلا گیا تو میں بھی
ہر چہ بادا باد از خود رفتہ کیوں نہ ہو جاؤں

صحبہ اُردو نصیبِ رضواں را
پیش ازیں مگر نہ گشت حالا باد

ترجمہ: داروئے بہشت کو اس کی صحبت
پہلے نہ ملی تو اب نصیب ہو

جا لطیف آں کہ داشت ایں جا نیز
در بہشت مخلص جا باد

ترجمہ: یہاں پر بھی چوں کہ وہ ستھری جگہوں پر رہتا تھا
وہاں جنت میں بھی اس کو مسکن جاوید ملے

واندر آں جاے دل کش و دل خواہ
ہرچہ دل خواہش سہا باد

ترجمہ: اور اُس دل کش اور پسندیدہ جگہ پر
جو چیز وہ چاہے اس کو مل جائے

عشوۂ دل براں پسندش بود
جلوۂ حور روزی او را باد

ترجمہ: یہاں اس کو محبوبوں کے تاز و عشوے پسند تھے
وہاں بھی جلوۂ حور اس کو نصیب ہو

راضی از دے چناں کہ خلقے بود
ہم چناں شاد حق تعالیٰ باد

ترجمہ: یہاں جس طرح خلق خدا اس سے خوش تھی
وہاں خداوند تعالیٰ بھی اس سے اسی طرح خوش ہو

یا اثر پاو ایس دعا و دگر
اور منش ہر تماں توں پاو

ترجمہ: اے خدا! اس دعا کو اثر دے! اور
دوسرے یہ کہ میری طرف سے اس کو ہر لمحے محبت ملے

گشتہ بود او سدا تمنا ما
دلہ ما نیز ہے تمنا پاو

ترجمہ: وہ ہمیشہ سرگشتہ تمنا رہا
خدا ہمارے دلوں کو بے تمنا کر دے

حور مانہ اگر ازو مستور
باشد ایس ہم دعا کہ رسوا پاو

ترجمہ: اگر حور اس سے چھپے
تو میری یہ دعا ہے کہ وہ حور بھی رسوا ہو

ماز ہر یک بر آں کہ روشن بود
درد ما ہم درد ہویدا پاو

ترجمہ: جس طرح اس پر ہمارے سارے دل کے راز روشن تھے
ہمارا درد بھی اس پر عیاں ہو

ہست آں جملہ معنی رنگیں
آں پہ باقی ہمانہ از ما یاد

ترجمہ: غالب نے تمام معنی رنگیں (اپنے اشعار میں) ہمانہ لے
جو باقی رہ گئے ہیں، وہ ہماری تا اہل کے سبب ہیں

تا بہ بینند حسن شاعریش
چشم اہل زمانہ بیجا باد

ترجمہ: تاکہ اس کی شاعری کا حسن نظر آتا رہے
خدا کرے کہ اہل زمانہ کی بصارت قائم رہے

یا رب! آں دل کہ در غمش گلداخت
پہ دل ست او ہر ز خار باد

ترجمہ: یا خدا! وہ دل، جو اس کے غم میں نہیں پکھا
پتھر سے بھی ہر (کوئی چیز) ہو جائے

مگر یہ غم غواریم اجل آئے
نذر او جان ناھکیا باد

ترجمہ: اگر اس کی غم غواری میں مجھے موت آئے
تو یہ جان ناھکیا اس کی نذر ہو

درد غمش ہر کہ ترک دنیا کرو
یا رہا او را ثواب عقی باد

ترجمہ: اس کے غم میں جس نے بھی ترک دنیا کیا
خدا یا! اس کو ثواب عاقبت ارزانی ہوا

قصہ طوف حرار او چہ کسم
پا نمودم اگر ز سر پا باد

ترجمہ: اس کے حرار کے طوف کا کیا ارادہ کروں
اگر میں پاؤں نہ ہو سکوں تو میرا سر پاؤں بن جائے

ہم لب کثر و لب تنہم
سر خوشی ہائے ام دو ہالا باد

ترجمہ: لب کھڑ و قشیم
خدا کرے اس کی سرمستیاں بڑھ چڑھ کر ہوں!

جز بہ جنت نغمہ اور آسودہ
خانہ اعتقاد من آباد

ترجمہ: وہ جنت کے علاوہ اور کہیں آسودہ نہیں ہو گا
خدا میری عقیدت کے گھر کو آباد رکھے!

در غمش خاک سشم و ہر من
کس نیاورد رم فلا باد

ترجمہ: میں اس کے غم میں خاک ہو گیا لیکن
سوائے ہوا کے میرے اوپر کسی کو رحم نہ آیا

انچہ امروز کرد کار نگو
حاصلش اجر روز فردا باد

ترجمہ: جس نے آج کے دن دنیا میں نیکی کی
خدا روزِ عاقبت اس کا اجر عطا فرمائے!

من کہ دورم ازو مرا یا رب!
سینہ صبرا و دیدہ وریا باد

ترجمہ: میں کہ جو اس سے چھڑ گیا ہوں
میرے سینے کو صبرا اور آنکھ کو وریا بنا دے

آہک تو گر ہمیں زمیں پہ گرفت
آہ من تفتہ! عرش کیا باد

ترجمہ: اگر میرے سارے آنسو زمین میں جذب ہو گئے
تو تفتہ! کاش میری آہ ہی عرش پر پہنچ جائے

نواہم شفاعت مرگ از زہیت
و تن من مباد جاں با باد

ترجمہ: اب میرے جسم میں جاں رہے نہ رہے
میرے لیے موت اور زہیت میں کوئی امتیاز نہ رہا

دو فراقی ہاں نہا سایہ
گر بگویم کلیم، عکلا باد

ترجمہ: اس ہما سایہ غالب کی فرقت میں
اگر میں مبرحاش کروں تو خدایا کبھی نہ ملے

ہر چہ کفتم بہ حق اود آں را
از اثری شہرہ تا شیا باد

ترجمہ: میں نے غالب کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہے
خدایا اس کا شہرہ زمین کی انتہائی پستیوں سے ملک کی انتہائی
بلندیوں تک پہنچا دے

ہر دہاں ہر خراب اکوں
ماند ملک سخن کیا آدم

ترجمہ: اب ملک سخن سارا کا سارا
خراب و دہاں ہے اور آخر چکا ہے

فخر مرقی و رنکب غالب مرد
اسد اللہ خاں غالب مرد

ترجمہ: (اس لیے کہ) فخر مرقی و رنکب غالب
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ

خلیق انجم

غالب کے خطوط (جلد اول)
خلیق انجم

نقش ہائے رنگ رنگ

مترجم: ڈاکٹر صابر آفاقی

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔ ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال

کراچی۔ ۷۵۳۰۰

الماس کے ریزے

مرزا مصباح الدین فیروز

خواتین کے اردو سفرناموں کا تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر صدف فاطمہ

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری

حیات اور ادبی کارنامے

ڈاکٹر محمد زاہد

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔ ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال

کراچی۔ ۷۵۳۰۰

Bar-e-Ghalib ka kuch bayan hojaey

By Partau Roheela

انجمن کی تازہ مطبوعات

قیمت	مصنف	نام کتاب
70/-	میر انیس خان آفغا	انجمنی رانی کنگلی
240/-	خلیق المم	مہتاب کے خطوط (جلد اول)
250/-	ڈاکٹر علی احمد غامی	۳۔ عبدالمعین شریہ، بیٹھہ، دہلی، بنگلہ
350/-	ڈاکٹر نسیم آرا	۴۔ اردو صحافت کے ارتقاء میں خواتین کا حصہ
300/-	ڈاکٹر شاد بیہ قمری	۵۔ چاہا کے اردو مولوی عبدالغنی احمد مراد آبادی
350/-	ڈاکٹر انیس مہدی	۶۔ اختر شیرانی اور چھپانہ اردو ادب
250/-	ڈاکٹر مولوی عبدالغنی	۷۔ قادیان اردو
250/-	مادر محی اسلمی عبدالغنی	۸۔ سب زمیں
400/-	مرثیہ من علیہ السلام ڈاکٹر محمد احمد غامی	۹۔ قادیان میں اردو ادب کے ترقی
	شہاب قدوسی	
400/-	ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خان	۱۰۔ اردو اور فارسی کے روابط
300/-	عزیز جعفری	۱۱۔ چھپانہ اردو شاعری (جلد اول)
300/-	ڈاکٹر مولوی عبدالغنی	۱۲۔ چھپانہ مصر
350/-	ڈاکٹر ذوالقرنین احمد (شیراز، دہلی)	۱۳۔ کوئی قرا سوجات و خطبات
150/-	پروفیسر مہدی علی	۱۴۔ اردو شاعری میں سے مہتابات کی تلاش
400/-	مرثیہ من علیہ السلام ڈاکٹر محمد احمد غامی	۱۵۔ کتاب سہ ماہی "اردو" (1999-2000)
	شہاب قدوسی	
400/-	ڈاکٹر انور سدید	۱۶۔ اردو ادب کی ترقی میں (شاعری و نظم)
320/-	ڈاکٹر محمد کامران	۱۷۔ پروفیسر محمد علی بیگ اردو ادبی خدمات
350/-	پروفیسر ربیعہ فاطمہ	۱۸۔ قادیان میں اردو کے افسانے (ایک نئی دہائی کا مطالعہ)
600/-	مرزا مصباح الدین فیروز	۱۹۔ انیس کے دربارے
400/-	ڈاکٹر صوفی ناصر	۲۰۔ خواتین کے اردو سوانحوں کا تحقیقی مطالعہ
300/-	ڈاکٹر محمد ارشد	۲۱۔ ڈاکٹر عبدالغنی بکھری۔ حیات اردو ادبی کارنامے